الله جل جلاله

خطباتِ فقیر

جلد بائیس



- ہمارے لئے اللہ کافی ہے
- قبولیتِ اعمال
- خوفِ خدا میں رونا
- یقینِ کامل کی اہمیت
- ذکرِ کثیر کے فوائد
- تصوف وسلوک

پیرِ طریقت، رہبرِ شریعت، مفکرِ اسلام

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ

مکتبۃ الفقیر

223 سنت پورہ فیصل آباد

+92-041-2618003

خطباتِ فقیر جلد ۲۲

ازافادات

محبوب العلماء والصلحاء
حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی
مجددی مدظلہم

مرتب
مولانا محمد حنیف نقشبندی

ناشر
مکتبۃ الفقیر
223 سنت پورہ فیصل آباد
041-2618003

نام کتاب ——— خطباتِ فقیر (جلد ۲۲)

از افادات ——— حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ

مرتب ——— مولانا محمد حنیف نقشبندی

ناشر ——— مکتبۃ الفقیر
223 سنت پورہ فیصل آباد

اشاعت اوّل ——— دسمبر 2009ء

اشاعت دوم ——— اپریل 2010ء

کمپیوٹر کمپوزنگ ——— ڈاکٹر شاہد محمود نقشبندی غفرلہٗ

پروف ریڈنگ ——— حضرت مولانا مفتی شاکر الرحمٰن نقشبندی
مولانا محمد افضل صاحب نقشبندی

تعداد ——— 1100

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

عرض ناشر

محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کے علوم ومعارف پر مبنی بیانات کو شائع کرنے کا یہ سلسلہ خطبات فقیر کے عنوان سے 1996ء بمطابق ۱۴۱۷ھ میں شروع کیا تھا اور اب یہ بائیسویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ جس طرح شاہین کی پرواز ہر آن بلند سے بلند تر اور فزوں سے فزوں تر ہوتی چلی جاتی ہے کچھ یہی حال حضرت دامت برکاتہم کے بیاناتِ حکمت ومعرفت کا ہے۔ ان کے جس بیان کو بھی سنتے ہیں ایک نئی پروازِ فکر آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ کوئی پیشہ ورانہ خطابت یا یاد کی ہوئی تقریریں نہیں ہیں بلکہ حضرت کے دل کا سوز اور روح کا گداز ہے جو الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر آپ تک پہنچ رہا ہوتا ہے۔ بقول شاعر ؎

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ خانہ

''خطبات فقیر'' کی اشاعت کا یہ کام ہم نے اسی نیت سے شروع کر رکھا ہے کہ حضرت اقدس دامت برکاتہم کی فکر سے سب کو فکر مند کیا جائے اور انہوں نے اپنے مشائخ سے علم وحکمت کے جو موتی اکٹھے کر کے ہم تک پہنچائے

ہیں، انہیں موتیوں کی مالا بنا کر عوام تک پہنچایا جائے۔ یہ ہمارے ادارے کا ایک مشن ہے جو ان شاء اللہ سلسلہ وار جاری رہے گا۔ قارئینِ کرام کی خدمت میں بھی گزارش ہے کہ اس مجموعہء خطبات کو ایک عام کتاب سمجھ کر نہ پڑھا جائے کیونکہ یہ بحرِ معرفت کے ایسے موتیوں کی مالا ہے جن کی قدر و قیمت اہلِ دل ہی جانتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ صاحب خطبات کی بے مثال فصاحت و بلاغت، ذہانت و فطانت اور حلاوت وذکاوت کا فقید المثال اظہار ہے جس سے اہلِ ذوق حضرات کو محظوظ ہونے کا بہترین موقع ملتا ہے۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی یا کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لئے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تا زیست اپنی رضا کیلئے یہ خدمت سر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائیں اور اسے آخرت کے لئے صدقہء جاریہ بنائیں۔ آمین بحرمت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

ڈاکٹر شاہد محمود نقشبندی غفرلہ
خادم مکتبۃ الفقیر فیصل آباد

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!

فقیر کو جب عاجز کے شیخ مرشد عالم حضرت مولانا پیر غلام حبیب نقشبندی مجددی نور اللہ مرقدہ نے اشاعت سلسلہ کے کام کی ذمہ داری سونپی تو ابتدا میں چند دن اپنی بے بضاعتی کے احساس کے تحت اس کام کے کرنے میں متذبذب رہا، لیکن حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ نے بھانپ لیا، چنانچہ فرمایا کہ بھئی تم نے اپنی طرف سے اس کام کو نہیں کرنا بلکہ اپنے بڑوں کا حکم پورا کرنا ہے، کیوں نہیں کرتے؟ مزید فرمایا کہ جب کبھی مجلسمیں بیان کے لیے بیٹھو تو اللہ کی طرف متوجہ ہو جایا کرو، بڑوں کی نسبت تمہاری پشت پناہی کرے گی۔ چنانچہ حضرت کے حکم اور نصیحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بندہ نے وعظ و نصیحت اور بیانات کا سلسلہ شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوئی، حلقہ بڑھتا رہا اور الحمد للہ شرکاء کو کافی فائدہ بھی ہوتا کیونکہ ان کی زندگیوں میں تبدیلی عاجز خود بھی دیکھتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد چہار اطراف سے بیانات کے لیے دعوتیں آنے شروع ہو گئیں۔ شیخ کا حکم تھا، سرتابی کی مجال کہاں؟ جب بھی دعوت ملی رختِ سفر باندھا اور عازمِ سفر ہوئے۔ اس کثرت سے اسفار ہوئے کہ بعض اوقات صبح ایک ملک، دوپہر دوسرے ملک اور رات تیسرے ملک میں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ملکوں کو محلّہ بنا دیا۔ اِس ناتواں میں یہ ہمت کہاں؟...... مگر وہ جس سے چاہیں کام لے لیتے ہیں۔ بقول شخصے ع

"قدم اٹھتے نہیں اٹھوائے جاتے ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ یہ میرے شیخ کی دعا ہے اور اکابر کا فیض ہے جو کام کر رہا ہے، وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۔

بیانات کی افادیت کو دیکھتے ہوئے کچھ عرصے بعد جماعت کے کچھ دوستوں نے ان کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کیا، مکتبۃ الفقیر نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری اٹھائی، یوں خطبات فقیر کے عنوان سے نمبروار یہ ایک سلسلہ چل پڑا۔ یہ عاجز کئی ایسی جگہوں پر بھی گیا جہاں یہ خطبات پہلے پہنچے ہوئے تھے اور وہاں علما طلبا نے کافی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

ان خطبات کے مطالعے میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے بلکہ بیانات کا مجموعہ ہے، ان میں علمی غلطی یا بھول کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اس لیے معزز علمائے کرام سے گزارش ہے کہ جہاں کہیں کوئی غلطی دیکھیں تو اصلاح فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ دعا ہے کہ جو حضرات بھی ان بیانات کی ترتیب و اشاعت میں کوشاں ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کی کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرمائیں اور انہیں اپنی رضا اپنی لقا اور اپنا مشاہدہ نصیب فرمائیں اور عاجز کو بھی مرتے دم تک اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائیں۔ آمین ثم آمین

دعا گو و دعا جو

فقیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی

کان اللہ لہ عوضا عن کل شیء

﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل﴾

(آل عمران: ۱۷۳)

ہمارے لیے اللہ کافی ہے

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

اقتباس

ایک مرتبہ یہ عاجز ایک ملک میں جا رہا تھا۔ وہاں ایک دیوار پر ایک عجیب فقرہ لکھا ہوا دیکھا۔ میں کافی دیر تک اس کو پڑھتا رہا۔ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ مگر لکھنے والے نے عجیب بات لکھ ڈالی تھی۔ لکھا ہوا تھا:

''اگر تم محسوس کرتے ہو کہ اللہ دور ہے تو یہ اندازہ لگاؤ کہ پیچھے کون ہٹا''

واقعی اللہ تعالیٰ تو اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ تو پھر پیچھے کون ہٹتا ہے؟ بندہ خود ہٹتا ہے۔ اگر ہم سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک اللہ رب العزت کے حکموں پر عمل کرنے والے بن جائیں تو اللہ تعالیٰ اس ایگری منٹ کے مطابق بندے کو یہ نعمتیں عطا فرمادیں گے۔ یہ دنیا میں کامیابی اور غلبہ حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ ہے۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

ہمارے لیے اللہ کافی ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ o بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o
﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ (آل عمران:۱۷۳)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ o وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ o
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

سبحان تیری قدرت:

انسان اگر اپنے اردگرد پھیلی ہوئی اس کائنات میں غور کرے تو یہ جلوہ گاہِ یار نظر آتی ہے۔قدم قدم پر اللہ رب العزت کی قدرت کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔یہ قدرتی مناظر اللہ رب العزت کی صفات کے آئینہ دار ہیں۔آسمان کی وسعتوں کو دیکھیں تو اللہ کی عظمت اور کبریائی سامنے آتی ہے۔انسان کا ذہن اتنا محدود ہے کہ اگر وہ سوچنا چاہے کہ آسمان کی انتہا کہاں ہے،تو دماغ میں نہیں آسکتی۔اگر کوئی یہ سوچے کہ اس کائنات کی وسعت کہاں تک ہے،تو دماغ میں سوچ سوچ کر کہ وہاں تک ہوگی،تو دماغ میں پھر سوچ آئے گی کہ اس سے آگے بھی کائنات ہے۔جس انسان کا دماغ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کائنات کی وسعت نہیں آسکتی،وہ اللہ کی ذات کو کیا سمجھ پائے گا!

⊙......ہم اگر سمندر کے طلاطم کو دیکھیں،سمندر کے اندر جو موجیں ایک دوسرے کے اوپر گر رہی ہوتی ہیں،ان کو دیکھ کر اللہ رب العزت کی رحمت کے بے پایاں سمندر کا اندازہ ہوتا ہے۔

◉ ...... سورج کو دیکھیں، جو ہر وقت نور برساتا ہے، تو بے اختیار دل میں بات آتی ہے، اللہ! آپ کی اپنی ذات کے نور کا کیا عالم ہوگا!

◉ ...... پھول کو دیکھیں تو اللہ رب العزت کا جمال نظر آتا ہے۔

◉ ...... شیر کو دیکھیں تو اللہ رب العزت کا جلال نظر آتا ہے۔ حالانکہ شیر ایک جانور ہے، مگر اس کے اندر اتنی ہیبت ہے، اتنا خوف ہے کہ بندہ اس کے قریب جاتا ہے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ! جس مخلوق کو آپ نے پیدا کیا اس کا اتنا جلال ہے تو جب آپ کسی بات پہ خفا ہوتے ہوں گے تو آپ کے جلال کا کیا عالم ہو گا!؟ جانوروں کو دیکھیں تو اللہ رب العزت کی فرمانبرداری کرنے کی سمجھ آجاتی ہے کہ جس جانور کو اللہ نے جس ہیئت پر پیدا کیا وہ پوری زندگی اسی پر گذار دیتا ہے۔

اللہ سب سے بڑا ہے:

سچی بات تو یہ ہے کہ اللہ رب العزت بہت بڑے ہیں۔ جتنا ہم سوچتے ہیں اس سے بھی بڑے ہیں، اور سوچیں تو اس سے بھی بڑے ہیں، اس سے بھی زیادہ سوچیں تو اس سے بھی زیادہ بڑے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں: ''اللہ اکبر''۔ اللہ سب سے بڑے ہیں۔

اذان کے شروع میں چار مرتبہ کہا جاتا ہے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ یہ چار مرتبہ کہنے کی حکمت کیا ہے؟ حکمت یہ ہے کہ مخلوق چار عناصر۔ آگ، پانی، ہوا، مٹی سے مل کر بنی ہے۔ کچھ مخلوق آگ سے بنی، جیسے جن۔ اسی طرح کچھ پانی کی مخلوق ہے، کچھ ہوا کی مخلوق ہے، کچھ مٹی سے بننے والی مخلوق ہے۔ جب مؤذن اللہ اکبر کہہ رہا ہوتا ہے تو وہ پیغام دے رہا ہوتا ہے کہ آؤ! اس پروردگار کی طرف

...... جو آگ اور اس کی مخلوق سے بھی زیادہ طاقت والا ہے۔

...... جو پانی اور اس کی مخلوق سے بھی زیادہ طاقت والا ہے۔

...... جو ہوا اور اس کی مخلوق سے بھی زیادہ طاقت والا ہے۔

......جو مٹی اور اس کی مخلوق سے بھی زیادہ طاقت والا ہے۔

آگ کی طاقت:

آگ اتنی طاقت والی ہے کہ جب یہ بڑھتی ہے تو پھر بجھائی نہیں جا سکتی۔ رشیا میں ایک جگہ سفر کرتے ہوئے ہم نے آگ کا ایک شعلہ دیکھا جو پتہ نہیں کتنے فرلانگ اونچا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا: بھئی! یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: جی تیل کا کنواں کھود رہے تھے، جب اس میں سے تیل نکلنے کا وقت آیا تو کسی فنی خرابی کی وجہ سے اس میں آگ لگ گئی۔ اب وہ تیل اتنے پریشر سے نکل رہا ہے اور اس میں آگ بھی لگی ہوئی ہے۔ یہ اتنی شدید آگ ہے کہ پوری دنیا کی کمپنیوں نے اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر لی ہے، سالوں گذر چکے ہیں مگر آج تک آگ نہیں بجھا سکے۔

پانی کی طاقت:

کبھی آپ نے پانی کی طاقت دیکھی ہے؟......اللہ اکبر......اگر کبھی سمندر میں طوفان آ جائے تو بڑے بڑے جہاز الٹے ہو جاتے ہیں۔ پانی کی طاقت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ فرنگی ماہرین نے Titanic (ٹائی ٹینک) نامی جہاز بنایا تو دعویٰ کیا کہ یہ ٹوٹ ہی نہیں سکتا یعنی پانی میں ڈوب ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ بحری جہاز ایک سمندری طوفان میں پھنس کر دو ٹکڑے ہو گیا اور ڈوب گیا۔

سیلاب آتا ہے شہروں کے شہر برباد کر دیئے جاتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا طوفان آیا تھا اس کو سونامی کا نام دیا گیا۔ لیکن شہروں کے شہر ختم ہو گئے۔ بلڈنگز ختم ہو گئیں۔ یہاں تک کہ انسانوں کا نام ونشان مٹ گیا۔ پانی کی اتنی طاقت ہے۔

ہوا کی طاقت:

ہوا کی طاقت کتنی ہے؟ قومِ عاد کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا۔ ان کے قد بڑے

لیکن اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ان کو دنیا میں بھیجیں۔ شیطان نے آ کر مشورہ دیا کہ یہ دانہ کھالیں تو آپ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ چنانچہ دانہ کھا لیا اور نتیجہ کیا نکلا؟ زمین پر اترنا پڑا۔ تو منشا کس کی پوری ہوئی؟ اللہ رب العزت کی۔

☆...... حضرت نوح علیہ السلام اللہ کے پیغمبر ہیں۔ طوفان آچکا ہے، کشتی میں سوار ہیں۔ سگا بیٹا سامنے کھڑا ہے۔ فرماتے ہیں:

﴿ یٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا ﴾ (ھود:۴۲)

''اے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جاؤ''

بیٹا سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ بات ہی نہیں مانتا...... آج کل بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ باپ دین کی کشتی پر سوار ہے اور بیٹا فسق و فجور کے طوفان میں ہے۔ باپ کہتا ہے: یٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا بیٹے! نیک بن جاؤ، آؤ ہمارے ساتھ دین کی کشتی میں سوار ہو جاؤ ،مگر وہ سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی اتنی چاہت ہے، لیکن بیٹا بالآخر

﴿ وَحَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ﴾ (۴۳:ھود)

ان دونوں کے درمیان پانی کی ایک موج حائل ہوگئی اور وہ والد کے سامنے طوفان میں غرق ہوگیا تو مرضی کس کی پوری ہوئی؟ اللہ رب العزت کی۔

⊙...... ایک موقعہ پر نبی علیہ السلام نے دل میں ارادہ فرما لیا کہ میں شہد استعمال نہیں کروں گا کیوں کہ اس میں ایک خاص قسم کی مہک آتی ہے۔ جب ارادہ فرما لیا تو رب کریم کی طرف سے محبوبانہ خطاب آگیا:

﴿ یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾ (التحریم:۱)

''اے نبی ﷺ! آپ اسے کیوں حرام کرتے ہیں جسے اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا؟ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ بخشنے والا نہایت رحم

کرنے والا ہے''

اس آیت کے نزول کے بعد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شہد کا استعمال دوبارہ شروع فرما دیا۔ پھر مرضی کس کی پوری ہوئی؟ اللہ رب العزت کی، تو یہ بات دل میں بٹھا لیجیے کہ اللہ رب العزت سب سے بڑے ہیں مرضی ہر حال میں اسی اللہ کی پوری ہوتی ہے۔

مشرک اور متکبر کا انجام:

اللہ کے سامنے کسی کی بڑائی نہیں چل سکتی۔ آپ غور کریں کہ دو بندے ایسے ہیں جن کو نہ تو جنت کی خوشبو مل سکے گی اور نہ ہی وہ جنت میں قدم رکھ سکیں گے...... کون؟ ایک مشرک۔ جس کے بارے میں فیصلہ ہی کر دیا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ (النساء:۱۱۶)

اللہ تعالیٰ مشرک کو معاف نہیں کریں گے۔ اس کے سوا کوئی بھی گناہ لے کر آئے گا چاہیں گے تو معاف کر دیں گے۔ دوسرا، حدیث پاک میں فرمایا:

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ

جس کے دل میں ذرہ کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

نہ مشرک نہ ہی متکبر

متکبر اسے کہتے ہیں جو اپنے آپ کو بڑا سمجھے۔ اور مشرک اسے کہتے ہیں جو مخلوق میں سے کسی کو بڑا سمجھے۔ جی ہاں! بڑا سمجھتا ہے تو سجدے کرتا ہے نا......تو جس نے اپنے آپ کو بڑا سمجھا، اس پر بھی جنت حرام۔ اس لیے جب ہم اللہ اکبر کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نہ میں بڑا نہ کوئی اور بڑا۔ بڑا کون ہے؟ اللہ رب العزت ہی

بڑے ہیں۔ جس نے دن میں پانچ مرتبہ مسجد میں بلایا، اس لیے کہ تم دنیا کے کاموں میں لگے ہوئے ہو، ہوسکتا ہے کہ تم سبق بھول جاؤ۔ تمہیں یاددہانی رہنی چاہیے۔

دو کلام ایسے ہیں جن کو سن کر شیطان دور بھاگتا ہے۔ ایک ''اللہ اکبر''۔ حدیث پاک میں آیا ہے: ''جب مؤذن ''اللہ اکبر'' کہتا ہے تو اس کو سنتے ہی شیطان دور بھاگتا ہے''۔ اور دوسرا کلام جس سے شیطان دور بھاگتا ہے وہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ہے۔ اس کلام سے تو اس کی ریح خارج ہوتی ہے۔

جلالِ خداوندی کے سامنے جبرئیل علیہ السلام کی حیثیت:

جبرئیل علیہ السلام اتنے بڑے ہیں اگر اپنے پر پھلائیں تو ایک پر سے مشرق کو ڈھانپ دیں اور دوسرے پر سے مغرب کو ڈھانپ دیں۔ زمین پر کھڑے ہوں تو ان کا سر آسمان کی بلندیوں کو چھوئے۔ طاقت اتنی ہے کہ زمین کے ٹکڑے کو پر سے اکھاڑا اور آسمان کی بلندیوں پر لے جا کر نیچے دے مارا۔

تیزی اتنی ہے کہ بارش کا ایک قطرہ زمین سے ایک بالشت کے فاصلے پر ہو تو اس سے پہلے کہ وہ قطرہ زمین پر پہنچے وہ آسمان سے زمین پر آکر واپس جا سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ بسا اوقات جبرئیل علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کے جلال کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ ان کا قد ایک چڑیا کے برابر بن جاتا ہے۔ ان کے ہاں اللہ رب العزت کی عظمت اتنی ہوتی ہے کہ وہ کانپ رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی اپنے دلوں میں اس اللہ کی عظمت کو بٹھانا چاہیے تاکہ گناہوں کا چھوڑنا آسان ہو جائے۔

ایک تعجب خیز بات:

سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے ایک مرتبہ بیان کیا تو ایک نوجوان آیا، وہ کہنے لگا: جی آپ نے ایک فقرہ بولا ہے۔ میں نے کہا: ہاں، کیا فقرہ بولا تھا؟

عَجَبًا لِضَعِیْفٍ یَعْصِیْ قَوِیًّا

''تعجب ہے اس ضعیف پر جو قوی کی نافرمانی کرتا ہے''

بندے سے زیادہ ضعیف کوئی نہیں اور اللہ سے زیادہ قوی کوئی نہیں ۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ضعیف ایک قوی کی نافرمانی کر رہا ہوتا ہے۔ جب دل میں عظمتِ خداوندی بیٹھ جاتی ہے تو پھر انسان آسانی سے گناہوں سے بچ سکتا ہے۔

ذکرِ کثیر کا مقصد:

اللہ رب العزت نے اسی لیے تو ذکر کثیر کا حکم دیا ہے:

﴿ اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴾

مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ ہر وقت اپنے دل میں اللہ کی یاد رکھیں کہ اللہ بہت بڑے ہیں پھر دنیا ان کا دل نہیں لبھا سکے گی۔ ان کو اس راستے سے نہیں ہٹا سکے گی۔ اس لیے مومن بہانے بہانے سے اللہ کی بات چھیڑ دیتا ہے...... اماں کو دیکھو وہ کہیں بھی ہو بیٹے کا تذکرہ چھیڑ دیتی ہے۔ کہتی ہے: میرا بیٹا دودھ کو دودھو کہتا ہے، وہ محبت سے کہہ رہی ہوتی ہے۔ بیوی کو خاوند سے محبت ہوتی ہے اسلیے وہ پانچ منٹ میں اپنے خاوند کی ساری باتیں دوسری عورتوں کو بتا دیتی ہے...... اسی طرح مومن کو اپنے رب سے محبت ہوتی ہے۔ اس لیے جہاں بھی وہ بیٹھتا ہے، اللہ کی بات کرتا ہے۔

''جہاں جاتے ہیں ہم تیرا افسانہ چھیڑ دیتے ہیں''

اللہ کا تذکرہ...... اللہ کی باتیں...... اللہ کی عظمت...... اللہ کی نعمتوں کے تذکرے کرنا مومن کا شیوہ ہوتا ہے۔

اللہ کے رجسٹرڈ بندے بنیے:

اگر آج ہم اللہ رب العزت کے ساتھ محبت کا اظہار کریں گے تو قیامت کے دن

عَجَبًا لِضَعِيفٍ يَعْصِي قَوِيًّا

''تعجب ہے اس ضعیف پر جو قوی کی نافرمانی کرتا ہے''

بندے سے زیادہ ضعیف کوئی نہیں اور اللہ سے زیادہ قوی کوئی نہیں۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ضعیف ایک قوی کی نافرمانی کر رہا ہوتا ہے۔ جب دل میں عظمتِ خداوندی بیٹھ جاتی ہے تو پھر انسان آسانی سے گناہوں سے بچ سکتا ہے۔

ذکرِ کثیر کا مقصد:

اللہ رب العزت نے اسی لیے تو ذکر کثیر کا حکم دیا ہے:

﴿ اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴾

مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ ہر وقت اپنے دل میں اللہ کی یاد رکھیں کہ اللہ بہت بڑے ہیں پھر دنیا ان کا دل نہیں لبھا سکے گی۔ ان کو اس راستے سے نہیں ہٹا سکے گی۔ اس لیے مومن بہانے بہانے سے اللہ کی بات چھیڑ دیتا ہے...... اماں کو دیکھو وہ کہیں بھی ہو بیٹے کا تذکرہ چھیڑ دیتی ہے۔ کہتی ہے: میرا بیٹا دودھ کو دوھو کہتا ہے، وہ محبت سے کہہ رہی ہوتی ہے۔ بیوی کو خاوند سے محبت ہوتی ہے اسلیے وہ پانچ منٹ میں اپنے خاوند کی ساری باتیں دوسری عورتوں کو بتا دیتی ہے...... اسی طرح مومن کو اپنے رب سے محبت ہوتی ہے۔ اس لیے جہاں بھی وہ بیٹھتا ہے، اللہ کی بات کرتا ہے۔

''جہاں جاتے ہیں ہم تیرا افسانہ چھیڑ دیتے ہیں''

اللہ کا تذکرہ...... اللہ کی باتیں...... اللہ کی عظمت...... اللہ کی نعمتوں کے تذکرے کرنا مومن کا شیوہ ہوتا ہے۔

اللہ کے رجسٹرڈ بندے بنیے:

اگر آج ہم اللہ رب العزت کے ساتھ محبت کا اظہار کریں گے تو قیامت کے دن

اس کا انعام پائیں گے۔ یہ جو ایمان ہے نا، یہ رجسٹریشن ہے بندے کی کہ یہ اللہ کی بندگی میں داخل ہو گئے اور اللہ کے رجسٹرڈ بندے بن گئے ہیں۔ ایک سکول تھا وہاں طلبا ایک کھڑکی کے سامنے لائن میں جا رہے تھے، اس کھڑکی کے پاس جانے پر ہر طالب علم کو مٹھائی کا ایک ڈبہ دیا جاتا تھا، ایک دیہاتی لڑکے نے جب یہ دیکھا کہ اس کھڑکی کے سامنے جانے پر مٹھائی کا ڈبہ ملتا ہے تو وہ بھی لائن میں لگ گیا، آگے بڑھتے بڑھتے اس دیہاتی کی بھی باری آ گئی، جب وہ کھڑکی کے پاس پہنچا تو مٹھائی کا ڈبہ دینے والے نے کہا: اپنا آئی ڈی کارڈ دکھاؤ! یہ کہنے لگا: وہ کیا ہوتا ہے؟ اس نے کہا: جو سٹوڈنٹس یہاں رجسٹرڈ ہیں ان کا ایک آئی ڈی کارڈ بنا ہوتا ہے اور ان کو یہ انعام میں مٹھائی کا ڈبہ مل رہا ہے، تم اگر رجسٹرڈ نہیں ہو تو پھر جاؤ یہاں سے۔ جیسے سکول کے رجسٹرڈ طلبا کو انعام میں مٹھائی کا ڈبہ ملا، اسی طرح آج جس نے ایمان کو رجسٹرڈ کروا لیا، کل قیامت کے دن جب اللہ کے پاس جائے گا تو انعام کا ڈبہ پالے گا۔ اور اگر کوئی دیہاتی کی طرح ویسے ہی لائن میں لگ کر چلا گیا تو اس کو کہا جائے گا۔ Prove your identity. کون ہو بھئی؟ کہاں سے آ گئے؟ دنیا میں کہاں تھے؟

ہر معاملے میں اللہ پر نظر رکھیے:

جیسے بچے کا تعلق ماں سے ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز میں اپنی ماں کی طرف دیکھتا ہے۔ مومن کا تعلق بھی اسی طرح اپنے پروردگار کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ہر معاملے میں اللہ پر نظر رکھتا ہے۔ ایک بزرگ کسی کے ہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ صاحب خانہ اپنے بچے کو اٹھا کر لے آیا۔ ان کے پاس کوئی میٹھی چیز تھی انھوں نے وہ بچے کی طرف بڑھائی مگر بچے نے لینے سے انکار کر دیا، دوبارہ کہا کہ لے لو! لیکن بچے نے پھر بھی انکار کر دیا۔ اب یہ بڑی عجیب بات ہے، حالانکہ بچے کے اندر میٹھی چیز کھانے

کی Temptation (شدید طلب) ہوتی ہے۔اس کی گروتھ کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ میٹھا کھائے،اس لیے بچے میٹھی چیز کے پیچھے پاگل ہو کر بھاگتے ہیں......لیکن جب ان بزرگوں نے بچے کو میٹھی چیز پیش کی تو اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور مٹھائی لینے سے انکار کر دیا۔

جب دو مرتبہ ان بزرگوں نے اس سے کہا تو بعد میں باپ نے بچے کو کہا: بیٹا لے لو! یہ ہمارے حضرت جی ہیں۔یعنی باپ نے بچے کو اجازت دی تو پھر بچے نے وہ مٹھائی لے لی۔اس پر ان بزرگوں کی آنکھوں سے آنسو آ گئے۔یہ دیکھ کر وہ صاحب خانہ معذرت کرنے لگا: جی! بچے نے بدتمیزی کر دی اور آپ سے مٹھائی نہیں لی،آپ اس کو محسوس نہ فرمائیں۔وہ کہنے لگے: نہیں نہیں،اس وجہ سے آنکھ سے آنسوں نہیں آئے، بلکہ مجھے یہ خیال آیا کہ اس کے اندر میٹھا کھانے کی چاہت بھی ہے،پھر بھی جب میں نے اس کو ایک دو دفعہ مٹھائی پیش کی تو اس نے اپنے ''ابا'' کو دیکھا،کاش! میرا بھی ایمان ایسا ہوتا کہ میں بھی ہر معاملے میں اپنے ''ربا'' کو دیکھ لیتا۔

ہم بھی تو باہر نکلتے ہیں، نیلی پیلی مٹھائیاں پھر رہی ہوتی ہیں نا۔ہم بھی ان مٹھائیوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بجائے اپنے رب کو دیکھیں کہ رب چاہتے ہیں تو دیکھوں گا،نہیں چاہتے تو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔

اللہ تعالیٰ مغیر الاحوال ہیں:

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اللہ رب العزت نے جس طرح اس کائنات کو پیدا کیا اسی طرح اس کائنات میں ادلنے بدلنے والے حالات بھی اللہ رب العزت کی منشا سے ہیں۔اللہ تعالیٰ مغیر الاحوال ہیں۔دن ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔

﴿ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ (آلِ عمران:۱۴۰)

''اور ہم انسانوں کے درمیان دن بدلتے رہتے ہیں''

نہ کسی پر ہمیشہ خوشی نہ کسی پر ہمیشہ غم، نہ ہمیشہ صحت نہ ہمیشہ بیماری، حالات ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ حالات اس لیے بدلتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو مختلف حالات میں آزماتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی بندہ کسی مصیبت یا پریشانی میں پھنس جائے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے کہ جی مصیبت ختم ہی نہیں ہوتی تو اس میں اصول سمجھیں کہ مصیبت اللہ رب العزت کی طرف سے آتی ہے۔

﴿ قُلْ لَّنْ يُّصِيبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ﴾ (التوبۃ:۵۱)

''کہہ دیجیے! ہرگز تم کو کوئی پریشانی نہیں پہنچتی مگر وہی جو اللہ نے مقدر میں لکھی ہوتی ہے''

جب مصیبت آتی ہی اللہ کی طرف سے ہے تو پھر مصیبت ختم ہونے کے لیے رجوع بھی اللہ کی طرف کرنا چاہیے۔ ہم کیا کرتے ہیں؟ مصیبت تو اللہ کی طرف سے آتی ہے اور اس کو دور کرنے کے لیے مخلوق کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں یہاں آکر معاملہ گڑ بڑ ہوتا ہے۔ جس نے پریشانی کے عالم میں اللہ رب العزت کی طرف رجوع کیا، اللہ رب العزت اس کے حالات کو سنوار دیتے ہیں۔

نامساعد حالات میں اللہ پر نظر:

انبیائے کرام کے واقعات قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ بتائے گئے تا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ پہلے والی مقدس ہستیوں پر بھی حالات آئے، انھوں نے ان حالات میں اللہ کی طرف رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے حالات کو سنوار دیا۔ ہم بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے بنیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی اللہ پر نظر:

حضرت نوح علیہ السلام تقریباً ایک ہزار سال تک اپنی قوم کو اللہ کی طرف آنے کی

دعوت دیتے رہے۔ بالآخر کہنے لگے:

﴿رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا﴾ (نوح:۵)

دن اور رات دعوت دی۔ مگر قوم ایسی تھی کہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ بہت تھوڑے سے لوگ تھے جو ماننے والے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی طبیعت بھر گئی، کیونکہ قوم بات بات پر مذاق اڑاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب انھوں نے کشتی بنانا شروع کی تو قوم پوچھتی تھی: کیوں بنا رہے ہو؟ وہ فرماتے: طوفان آئے گا۔ تو وہ کہتے ہم تو دعائیں مانگتے ہیں کہ طوفان آئے، ریت پر کشتی تھوڑا چلے گی۔ تو حضرت نوح علیہ السلام فرماتے:

﴿اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ﴾ (ھود:۳۸)

''جیسے تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو ایک وقت آئے گا کہ ہم تمہارا مذاق اڑائیں گے''

تو قوم نے ستا دیا تھا۔ وہ اتنے پتھر مارتے تھے کہ آپ پتھروں میں دب جاتے تھے۔ بسا اوقات جبرئیل علیہ السلام آکر ان کو پتھروں سے نکالتے تھے، اکیلے تھے۔ دیکھیں! انسان کے دل پر کتنا غم ہوتا ہے۔ آپ کسی کو چند دن تک کوئی بات سمجھائیں، آپ تنگ آجائیں گے۔ ایک سال کی بات نہیں دو سال کی نہیں ایک ہزار سال کی...... اللہ اکبر کبیرا۔ دل میں ایک کرب تھا، ایک غم تھا، جس نے ان کو مغموم بنا دیا تھا۔ چنانچہ بالآخر انھوں نے اللہ رب العزت سے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ لَقَدْ نَادٰنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ﴾ (الصّٰفّٰت:۷۵)

''اور تحقیق نوح علیہ السلام نے ہمیں پکارا اور ہم پکار کا بہتر جواب دینے والے ہیں''

﴿وَ نَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ﴾ (الصّٰفّٰت:۷۶)

''اور ہم نے ان کو اور ان کے اہلِ خانہ کو کربِ عظیم سے نجات دلائی''

تو اس کرب سے ،ان مصیبتوں سے بچانے والا کون ہے؟ اللہ رب العزت ہے۔

بنی اسرائیل احسانِ خداوندی:

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام، دونوں پیغمبر فرعون کی طرف بھیجے گئے۔ انھوں نے اس کو جا کر دعوت دی لیکن فرعون نے اپنی حکومت کے نشے میں ان کی قوم کو پیس کے رکھ دیا۔

﴿يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَ كُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَ كُمْ﴾ (ابراھیم:۶)

''بیٹوں کو قتل کر دیتے، بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے''

آپ ذرا سوچیں وہ کتنا جابر بادشاہ ہوگا! آج کسی کے بچے کو ناحق قتل تو کروا کے دیکھے اگلے دن اس کو اپنی حکومت چھوڑنی پڑ جائے گی۔ جی ہاں! ایک بچے کے قتل کی وجہ سے ایسا ممکن ہے۔ وہاں فرعون نے سینکڑوں نہیں، ہزاروں قتل کروائے، کوئی کوئی اف بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس قوم کے اوپر فرعون کا کتنا ہولڈ ہوگا۔ اس عاجز کو مصر میں فرعون کی لاش دیکھنے کا موقع۔ اندازاً چھ فٹ اس کا قد تھا۔ تاریخ اٹھا کر دیکھی تو لکھا ہوا تھا کہ وہ بیس سال کی عمر میں ملک کا بادشاہ بن گیا تھا، اور تقریباً پینسٹھ سال تک ملک کا بادشاہ رہا۔ جس کو نوجوانی میں ہی اقتدار مل گیا ہو تو پھر اس کے اندر فرعونیت آہی جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو اس کے ظلم سے نجات عطا فرمائی۔

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَ كَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

(الانبیاء:۸۸)

''اور ہم نے اس کی اس پکار کو قبول کر لیا اور ہم نے اس کو غم سے نجات عطا فرمائی، اور ہم ایمان والوں کو ایسے ہی نجات عطا فرما دیتے ہیں''

اگر ہم اللہ کو پکاریں گے تو کرب سے، غم سے، مصیبت سے، پریشانی سے ہمیں وہ پروردگار ہی بچانے والا ہے۔ آج ذرا کوئی بات ہوتی ہے تو بھاگتے ہیں عملیات والوں کے پیچھے۔ کیا فائدہ ایمان خراب کرنے کا؟ جاؤ تو کسی صاحبِ شریعت بندے کے پاس جاؤ تاکہ کم از کم شریعت پر عمل تو ہو۔ تو ہم نے مصیبت اور پریشانی میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا ہے۔ جس نے پریشانی بھیجی ہے وہی ہمیں پریشانی سے دور کرسکتا ہے۔ اللہ رب العزت کا یہ وعدہ ایمان والوں کے ساتھ ہے کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے احکام پر ثابت قدم رہیں گے تو وہ رب کریم ہمیں ہر مصیبت اور پریشانی سے نجات عطا کرے گا۔

حضرت ابرہیم علیہ السلام کی اللہ پر نظر:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم میں اکیلے تھے۔ قوم شرک کرتی ہے اور نمرود کو خدا مانتی ہے بتوں کی پوجا کرتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو توحیدِ خالص پر عمل کرنے والے ہیں۔ ایک موقع پر قوم نے کوئی فنکشن منانا تھا۔ چنانچہ وہ ان کو بھی کہنے لگے: چلو ہمارے ساتھ! مگر انھوں نے قوم کو معذرت کردی اور فرمایا:

﴿اِنِّیْ سَقِیْمٌ﴾ (الصّٰفّٰت:۸۹) ’’میری طبیت ٹھیک نہیں ہے‘‘

واقعی اس کفر و شرک کے ماحول کو دیکھ کر ان کی طبیعت کتنی بیزار ہوتی ہوگی۔ قوم چلی گئی پیچھے ان کے بت اکیلے تھے، سیدنا ابرہیم علیہ السلام نے بھی کیا مزے کا کام کیا۔ ایک کلہاڑا لیا،

﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِیْرًا ﴾ (الانبیاء:۵۸)

سارے بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کلہاڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا۔ جب قوم آئی اور اس نے اپنے معبودوں کا یہ حشر دیکھا تو کہنے لگے یہ کام کس نے کیا؟ تو ان میں سے کسی نے کہا:

﴿اِنَّا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ﴾ (الانبیاء: ۶۰)

ہم نے ابرہیم علیہ السلام نامی ایک نوجوان کے بارے میں سنا ہے، وہ ان بتوں کے بارے میں اس طرح کی ناگواری کی باتیں کرتا تھا۔ لگتا ہے یہ کام اسی نے کیا ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے ابراہیم علیہ السلام کو پکڑ لیا اور پوچھا: آپ نے فرمایا: اس بڑے بت سے پوچھو۔ یہ جواب سن کر ہکا بکا رہ گئے کہ کیا کہیں؟

نتیجہ کیا نکلا؟ وہ کہنے لگے:

﴿حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْ﴾ (الانبیاء: ۶۸)

''اسے آگ میں ڈال دو اور معبودوں کی مدد کرو''

کیا معبود ان کے؟ پتھر کے بنے ہوئے، پتلے خدا، موٹے خدا، چھوٹے خدا ہیں! سب کے سب چھوٹے خدا۔ اب اس وقت ابرہیم علیہ السلام کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں تھا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ نمرود نے حضرت ابرہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کی تیاریاں کیں۔ اس زمانے کی عورتیں منت مانتی تھیں کہ اگر میرا بیٹا ہوا تو ابراہیم علیہ السلام کی چتا کے لیے اتنے من لکڑیاں ڈالوں گی۔ اتنی لکڑیاں اکٹھی کی گئیں کہ پہاڑ نظر آتا تھا، ان لکڑیوں کو آگ لگائی گئی۔ اتنی آگ تھی کہ اس کے قریب کوئی جا ہی نہیں سکتا تھا، جھولے پر بٹھا کے ڈالا گیا۔ حضرت ابرہیم علیہ السلام کو آگ نظر آرہی تھی لیکن ان کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان پختہ تھا۔ سنیے! امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

قَوْله تعالىٰ: ﴿قَالُوْا حَرِّقُوْهُ﴾ لَمَّا انْقَطَعُوْا بِالْحُجَّةِ اَخَذَتْهُمْ عِزَّةٌ بِاِثْمٍ وَانْصَرَفُوْا اِلىٰ طَرِيْقِ الْغَشْمِ وَالْغَلَبَةِ وَ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ رُوِىَ اَنَّ قَائِلَ هٰذِهِ الْمَقَالَةِ هُوَ رَجُلٌ مِنَ الْاَكْرَادِ مِنْ اَعْرَابِ فَارِسٍ اَىْ مِنْ

بَادِيَتِهَا: قاله ابنُ عُمَرَ وَ مُجَاهِدٌ و ابنُ جُرَيْجٍ ۔و يقالُ اسمُهُ هَيْزَرُ فَخَسَفَ اللّٰهُ بِهِ الْاَرْضَ فَهُوَ يَتَجَلْجَلُ فِيْهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَ قِيْلَ بَلْ قَالَهُ مَلِكُهُمْ نَمْرُوْدُ ﴿وَ انصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْ﴾ بِتَحْرِيْقِ اِبْرَاهِيْمَ لِاَنَّهُ يَسُبُّهَا وَ يُعِيْبُهَا وَ جَاءَ فِي الْخَبَرِ: اَنْ نَمْرُوْدَ بَنٰى صَرْحًا طُوْلَهُ ثَمَانُوْنَ ذِرَاعًا عَرْضُهُ اَرْبَعُوْنَ ذِرَاعًا قَال ابن اسحاق: وَ جَمَعُوْا الْحَطَبَ شَهْرًا ثُمَّ اَوْقَدُوْهُ وَاشْتَعَلَتْ وَاشْتَدَّتْ، حَتّٰى اَنْ كَانَ الطَّائِرُ لَيَمُرُّ بِجَبَاتِهَا فَيَحْتَرِقُ مِنْ شِدَّةِ وَهْجِهَا ثُمَّ قَيَّدُوْا اِبْرَاهِيْمَ وَ وَضَعُوْهُ فِي الْمِنْجَنِيْقِ مَغْلُوْلاً و يقالُ اِنَّ اِبْلِيْسَ صَنَعَ لَهُمُ الْمِنْجَنِيْقَ يَوْمَئِذٍ، فَضَجَّتِ السَّمٰوَاتُ وَالْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ مِنَ الْمَلَائِكَةِ وَ جَمِيْعَ الْخَلْقِ اِلَّا الثَّقَلَيْنِ ضَجَّةً وَاحِدَةً رَبَّنَا، اِبْرَاهِيْمُ لَيْسَ فِي الْاَرْضِ اَحَدٌ يَعْبُدُكَ غَيْرُهُ يُحْرَقُ فِيْكَ فَأْذَنْ لَنَا فِي نُصْرَتِهِ فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنِ اسْتَغَاثَ بِشَيْءٍ مِّنْكُمْ اَوْ دَعَاهُ فَلْيَنْصُرْهُ فَقَدْ اَذِنْتَ لَهُ فِي ذَالِكَ وَاِنْ لَمْ يَدْعُ غَيْرِي فَاَنَا اَعْلَمُ بِهِ وَ اَنَا وَلِيُّهُ فَلَمَّا اَرَادُوْا اِلْقَائَهُ فِي النَّارِ اَتَاهُ خُزَّانُ الْمَاءِ، وَهُوَ فِي الْهَوَاءِ ،فَقَالُوْا يَا اِبْرَاهِيْمُ اِنْ اَرَدْتَ اَخْمَدْنَا النَّارَ بِالْمَاءِ، فَقَالَ لَا حَاجَةَ لِيْ اِلَيْكُمْ وَ اَتَاهُ مَلَكُ الرِّيْحِ فقال: لَوْ شِئْتَ طَيَّرْتُ النَّارَ فَقَالَ: لَا، ثُمَّ رَفَعَ رَاْسَهُ اِلَى السَّمَاءِ فَقَالَ اَنْتَ الْوَاحِدُ فِي السماء وَ اَنَا وَاحِدٌ فِي الْاَرْضِ لَيْسَ اَحَدٌ يَعْبُدُكَ غَيْرِي حَسْبِيَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ:

قوم کے لوگوں نے کہا: کہ جلاؤ۔ جب ان کی حجت منقطع ہو گئی تو وہ ظلم کے طریقے پر چل نکلے (حکومت اور طاقت کے نشے میں بات تو کر نہیں سکتے تھے چنانچہ)

کہنے لگے: اس کو جلادو! روایت کی گئی ہے کہ اس بات کو کہنے والا اعراق کے دیہاتیوں میں سے ایک کرد آدمی تھا۔ ابن عمر، مجاہد اور ابن جریج نے اس بندے کا نام ''ہیرز'' لکھا ہے۔ اللہ نے اس بندے کو زمین میں دھنسا دیا اور وہ قیامت تک زمین کے اندر دھنسا ہوا چیختا رہے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے بادشاہ نمرود نے کہا تھا کہ تم اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ اس لیے ابراہیم علیہ السلام نے ان کے بارے میں ناپسندیدہ الفاظ کہے تھے اور ان میں عیب نکالا تھا (کہ ان سے پوچھو! وہ تو بتا نہیں سکتے تھے) اور خبر میں یہ بات آتی ہے کہ نمرود نے ایک گڑھا کھدوایا۔ اس کی لمبائی اسی ہاتھ تھی اور چوڑائی چالیس ہاتھ تھی۔ ابنِ اسحاق فرماتے ہیں کہ وہ ایک مہینہ تک اس میں لکڑیاں جمع کرتے رہے۔ پھر انہوں نے آگ کو جلایا، آگ جل اٹھی اور بھڑک گئی۔ حتی کہ اگر کوئی پرندہ اس آگ کے اوپر سے گزرنے لگتا تھا تو شدت کی وجہ سے وہ جل کر نیچے گر جاتا تھا (پرندہ بھی اوپر سے نہیں گذر سکتا تھا) پھر انھوں نے ابرھیم علیہ السلام کو قید کیا پکڑا اور ان کو منجنیق میں بٹھایا، اس کے وقت ان کے ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ (یوں سمجھ لیں کہ ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھی) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابلیس ایک بندے کی شکل میں آیا تھا اور اس نے آکر ان کو جھولا بنانے کا گر سکھایا تھا۔ (ہدایت دینے والا وہ تھا کہ اس طرح یوں کر کے جھولا بناؤ) آسمان زمین اور جو کچھ اس میں ہے، چیخنے لگے۔ ملائکہ اور ساری مخلوق سوائے انسانوں اور جنوں کے (انسانوں اور جنوں کے سوا جتنی مخلوق تھی، جب اس نے یہ منظر دیکھا کہ آگ جل رہی ہے تو چیخ اٹھی، کیونکہ ایک بندے کے لیے چند فٹ کی آگ بھی کافی ہو سکتی ہے اور یہ اتنی آگ تھی کہ پرندے بھی قریب سے نہیں گذر سکتے تھے۔ پھر جھولے میں بٹھایا گیا ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ اب وہ جھولا جھلا کر ان کو آگ میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس وقت آسمان اور زمین اور اس کے اندر کی مخلوق پکار اٹھی۔ کہنے

لگی: اے ہمارے پروردگار! ابرہیم اکیلا ہی تو زمین میں ہے جو تیری عبادت کرتا ہے اس کے علاوہ کوئی نہیں کرتا۔ آپکی خاطر اسے جلایا جارہا ہے، ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم ابراہیم کی مدد کرسکیں۔ جیسے کسی پریشانی میں دیکھ کر کہتے ہیں:

Can I help you? What can I do for you?

کیا میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں؟ میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟

تو ساری مخلوق نے بھی یہی بات کی کہ آپ اجازت دے دیں کہ ہم آپ کے ابراہیم کی مدد کرسکیں) اللہ رب العزت نے فرمایا: اگر میرا ابراہیم تم سے مدد مانگے یا تمھاری اس دعوت پر مدد قبول کرے تو تم اس کی مدد کرو۔ میری طرف سے اجازت ہے اور اگر وہ میرے کسی غیر کو نہیں پکارتا تو میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں اور میں اس کا سرپرست ہوں۔ سبحان اللہ! جو بندہ اللہ سے لو لگاتا ہے، اللہ رب العزت اس کے حالات کو بھی جانتے ہیں اور اللہ اس بندے کے سرپرست بھی ہوتے ہیں اس کے نگران اور اور نگہبان ہوتے ہیں) جب ان لوگوں نے ارادہ کرلیا کہ ابراہیم کو آگ میں ڈالیں: ان کے پاس پانی کے فرشتے آئے اس وقت ابراہیم ہوا میں تھے۔ یعنی منجنیق سے نکل کر آگ میں جانے کے لیے ابھی ہوا کے اندر ہیں کہ پانی پر مامور فرشتے آتے ہیں، وہ کہتے ہیں: اے ابراہیم! اگر آپ چاہیں تو ہم اس آگ کو پانی سے ابھی بجھا دیتے ہیں یعنی بارش برسا دیں گے تو یہ آگ ختم ہو جائے گی۔ (ابراہیم علیہ السلام کا یقین اور ایمان دیکھیے) فرمایا: مجھے آپ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ (دنیا کی اسباب کی نفی تو اپنی جگہ فرشتے آتے ہیں اور فرشتوں کو بھی کہہ دیا کہ مجھے آپ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پھر ان کے بعد ہوا کا فرشتہ آیا۔ اگر آپ کہیں تو ایسی ہوا چلے کہ آگ کو ہی اڑا کے لے جائے۔

ابراھیم علیہ السلام نے فرمایا: نہیں۔ پھر انھوں نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کہا:

اے اللہ! تو آسمان میں اکیلا ہے۔ میں زمین میں اکیلا ہوں، میرے سوا تیری عبادت کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ میرے لیے اللہ کافی ہے، وہی میرے لیے بہتر وکیل ہے۔ اللہ اکبر! ایمان دیکھیے کیسا تھا! اللہ کے وعدوں پر یقین کتنا تھا! بھروسہ کتنا تھا! سامنے آگ نظر آرہی ہے، ہوا کے اندر ہیں، اب تو لمحوں کی بات ہے، مگر متزلزل نہیں ہوئے۔ ابی بن کعب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت کرتے ہیں:

اِنَّ اِبْـرَاهِيْـمَ حِيْـنَ قَيَّـدُوْهُ لِيُـلْـقُوْهُ فِي النَّـارِ قَـالَ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اَنْـتَ سُبْحَانَكَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ لَكَ الْحَمْدُ وَ لَكَ الْمُلْكُ لَا شَرِيْكَ لَكَ، قَالَ ثُمَّ رَمَوْا بِهٖ فِي الْمَنْجَنِيْقِ مِنْ مَضْرِبٍ شَاسِعٍ فَاسْتَقْبَلَهٗ جِبْرِيْلُ ، فَقَالَ: يَا اِبْرَاهِيْمُ اَلَكَ حَاجَةٌ؟ قَالَ اَمَّا اِلَيْكَ فَلَا :فَقَالَ جِبْرِيْلُ فَاسْئَلْ رَبَّكَ ، فَقَالَ حَسْبِيْ مِنْ سُؤَالِيْ عِلْمُهٗ بِحَالِيْ، فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَ هُوَ اَصْدَقُ الْقَائِلِيْنَ: ﴿يَا نَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ o﴾ قَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ :جَعَلَ اللّٰهُ فِيْهَا بَرْدًا يَرْفَعُ حَرَّهَا، وَ حَرًّا يَرْفَعُ بَرْدَهَا، فَصَارَتْ سَلَامًا عَلَيْهِ قَالَ اَبُو الْعَالِيَةِ: وَ لَوْ يَقُلْ بَرْدًا وَّ سَلَامًا لَكَانَ بَرْدُ هَا اَشَدُّ عَلَيْهِ مِنْ حَرِّهَا ،وَ لَوْ لَمْ يَقُلْ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ ، لَكَانَ بَرْدُهَا بَاقِيًا عَلَى الْاَبَدِ ، وَ ذِكْرُ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَنْزَلَ زِرْبِيَّةً مِنَ الْجَنَّةِ فَبَسَطَهَا فِي الْجَحِيْمِ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ مَلَائِكَةً: جِبْرِيْلَ وَ مِيْكَائِيْلَ وَ مَلَكَ الْبَرْدِ وَ مَلَكَ السَّلَامَةِ ۔وَقَالَ عَلِيٌّ وَ ابْنُ عَبَّاسٍ۔ وَ لَوْ لَمْ يَتَّبِعُ بَرْدَهَا سَلَامًا لَمَاتَ اِبْرَاهِيْمُ مِنْ بَرْدِهَا ،وَ لَمْ تَبْقَ يَوْمَئِذٍ نَارٌ اِلَّا طَفِئَتْ ظَنَنْتُ اَنَّهَا تَعْنِيْ ۔قَالَ السُّدِيُّ: وَ اَمَرَ اللّٰهُ كُلَّ عَوْدٍ مَنْ شَجَرَةٍ اَنْ يَّرْجِعَ اِلٰى شَجَرَةٍ وَ يَطْرَحُ ثَمَرَتَهٗ ۔وَ قَالَ كَعْبٌ وَ قِتَادَةُ:لَمْ تَحْرِقِ النَّارُ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ

اِلَّا وَ ثَاقَهُ۔ وَ قَالَ كَعْبُ وَ قَتَادَةُ وَالزهرى: وَلَمْ تَبْقَ يَوْمَئِذٍ دَابَّةٌ اِلَّا اُطْفَأَتْ عَنْهُ النَّارَ اِلَّا الْوَزَغَ فَاِنَّهَا كَانَتْ تَنْفُخُ عَلَيْهِ؛ فَلِذٰلِكَ اَمَرَ رَسُوْلِ اللّٰهِ بِقَتْلِهَا وَ سَمَّاهَا فُوَيْسِقَهُ

’’جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں میں ڈالنے کے لیے انھوں نے قید کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا: نہیں کوئی معبود سوائے تیرے، تو جہانوں کا پروردگار ہے، سب تعریفیں تیرے لیے ہیں اور تیرے لیے ہی بادشاہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں‘‘ پھر انھوں نے ان کو منجنیق میں بٹھا کر دور سے آگ کے اندر ڈالا۔ اس موقع پر پھر جبرئیل علیہ السلام آئے۔ پانی کے فرشتے کو انکار کر دیا، ہوا کے فرشتے کو انکار کر دیا، (جبرئیل تو انبیا کی مدد پر متعین ہیں، انبیا کی مدد کرنا ان کا چارٹر آف ڈیوٹی ہے) جبرئیل علیہ السلام نے آ کر پوچھا: اے ابراہیم علیہ السلام! کیا آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اگر تم اپنی طرف سے آئے ہو تو مجھے تمھاری کوئی ضرورت نہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: اے ابراہیم خلیل اللہ! پھر اپنے رب سے سوال کیجیے۔ (جب جبرئیل نے یہ بات کی تو ابراہیم علیہ السلام نے عجیب بات کی) فرمایا: سوال کرنے سے یہ بات زیادہ کافی ہے کہ میں جس حال میں ہوں میرا اللہ جانتا ہے۔ (میرے لیے یہ بات کافی ہے، مجھے سوال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میرا پروردگار دیکھنے والا جاننے والا ہے) پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اور وہ بات کرنے والوں میں سے زیادہ سچا ہے۔ (رب کریم نے آگ کو براہ راست حکم دیا) فرمایا: اے آگ! میرے ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا۔ بعض علما نے یہ فرمایا: اللہ نے اس میں ایسی ٹھنڈک پیدا کر دی جس نے گرمی کو ختم کر دیا اور ایسی گرمی پیدا کر دی جس نے ٹھنڈک ختم کر دیا (آج کے زمانے میں آپ اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ماحول ایئر کنڈیشنڈ بن گیا، نہ آگ محسوس ہوتی تھی اور نہ ہی یخ بستہ ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی)

چنانچہ وہ ابراہیم علیہ السلام پر سلامتی والی بن گئی۔ابو العالیہ فرماتے ہیں: اگر اللہ تعالیٰ ﴿بَرْدًا وَّ سَلٰمًا﴾ ساتھ نہ کہتے تو اتنی ٹھنڈک ہو جاتی کہ ابراہیم علیہ السلام اس ٹھنڈک کی وجہ سے اللہ کو پیارے ہو جاتے۔(تو اکیلا بَرْدًا نہیں کہا، بلکہ سَلٰمًا۔یعنی سلامتی والی بھی کہا)۔اور اگر اللہ تعالیٰ عَلٰٓی اِبْرٰهِيْمَ نہ کہتے تو اس کی ٹھنڈک قیامت تک اسی طرح موجود رہتی۔(یعنی جب ابراہیم علیہ السلام تھے اس وقت تک ٹھنڈی ہونے کا حکم ہوا۔اللہ اکبر کبیرا) بعض علما نے یہ لکھا ہے: اللہ تعالیٰ نے ایک مخملی چادر اتاری اور اس کو اس آگ کے اندر بچھا دیا (ابراہیم کے لیے) اور اللہ تعالیٰ نے فرشتوں (جبرئیل علیہ السلام، میکائیل علیہ السلام ،ٹھنڈک کے فرشتے اور سلامتی کے فرشتے) کو اتارا۔اور حضرت علی اور ابن عباس فرماتے ہیں کہ اگر ٹھنڈی ہو جا کے بعد سلامتی والی ہو جا نہ کہتے تو ابراھیم اس ٹھنڈک سے ہلاک ہو جاتے۔

اور اس دن دنیا سے ہر آگ بجھ گئی، کیونکہ ہر آگ نے سمجھا شاید یہ حکم مجھے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر لکڑی کو حکم دیا کہ واپس اپنے درخت سے جا لگے اور کعب قتادہ فرماتے ہیں کہ اس دن سوائے چیل کے کوئی جانور ایسا نہ رہا جس نے آپ علیہ السلام کی آگ نہ بجھائی ہو، اور یہ چیل مزید آگ کو پھونک رہی تھی اسی وجہ سے نبیؐ کے اس کے قتل کا حکم فرمایا اور اس کا نام فوسیقہ رکھا۔

حضرت علی ابن عباس رضی اللہ عنہ ایک عجیب بات فرماتے ہیں۔جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: اے آگ! تو سلامتی والی ہو جا۔تو اللہ تعالیٰ نے اس حکم میں ''یَا نَارُ'' کہا تھا اس کے لیے سب میں عموم تھا۔چنانچہ اس حکم کے آتے ہی ابراہیم علیہ السلام کی آگ کے ساتھ پوری دنیا میں جہاں آگ جل رہی تھی ہر جگہ بجھ گئی۔کہ شاید میرے مالک کا یہ حکم مجھے دیا جا رہا ہو،، اس سے پتہ چلا کہ اللہ رب العزت انسان کو مصیبتوں سے بچا لیتے ہیں۔اگر دنیا کے ظاہری اسباب نہ بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ اسباب کو براہ راست حکم

فرما کر اس کو بندے کی فیور میں بنا دیتے ہیں۔تو یہاں سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہمیں اللہ پر پکا یقین رکھنا چاہیے اور اس کے وعدوں پر بھروسہ رکھنا چاہیے اس لیے کہ اس کے وعدے ہر حال میں سچ ثابت ہوتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حفاظتِ خداوندی:

جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ایک بات ارشاد فرمائی:

﴿لَا تَخَافَا اِنَّنِیْ مَعَكُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی﴾ (طٰہٰ:۴۶)

''تم دونوں خوف نہ کھاؤ، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، (فرعون جو بات کہے گا وہ) میں سنوں گا اور (جو عمل کرے گا) میں دیکھوں گا''

یعنی جب سننے والا اور دیکھنے والا ہوں اور تمہارے ساتھ ہوں تو تمہیں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟اسی طرح ہر مومن کے ساتھ اللہ کا یہ وعدہ کہ جو حکموں پر ثابت قدم رہے گا،اس کے ساتھ جو بھی پنگا لے گا، اللہ اس کو دیکھے گا اور اللہ اس کو سنے گا۔اور جب اللہ ساتھ ہے تو پھر پریشانی کس بات کی ہے،اللہ نے اپنے ایمان والے بندوں کو اس لیے تسلی دے دی کہ وہ بالکل پرسکون ہو جائیں۔ظاہر کی آنکھ سے جو کچھ نظر آتا ہے اس پر فیصلہ نہ کریں، بلکہ اللہ کے وعدوں پر بھروسہ کریں، یہی ایمان کا تقاضا ہے۔

خاتم الانبیاء اور حفاظتِ خداوندی:

جب سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کا ارادہ فرما چکے تو کافروں نے سوچا کہ ہم ہر قبیلے سے ایک ایک دو دو بندے لے کر مکان گھیرے میں لے لیتے ہیں اور جب صبح کے وقت نماز کے لیے نکلیں گے تو ایک ہی وقت میں حملہ کر کے سب کے سب ان کا

کام تمام کر دیں گے۔ پھر قریش اپنے قبیلے والوں کے ساتھ کیسے لڑیں گے ان کی یہ پلاننگ تھی لیکن اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ اِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ وَ یَمْكُرُوْنَ وَ یَمْكُرُ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ﴾ (الانفال عزوجل)

''اور یاد کرو اس وقت کو جب آپ کے خلاف تدبیر کی کافروں نے کہ آپ کو حبسِ بے جا میں رکھیں، یا آپ کو شہید کر دیں، یا آپ کو دیس نکالا دے دیں۔ انھوں نے بھی تدبیر کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی۔ اور اللہ تعالیٰ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے''۔

چنانچہ نبی اپنے گھر سے باحفاظت باہر تشریف لے آتے ہیں مگر ان کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ پھر آپ غارِ ثور کے اندر تشریف لے گئے۔ جب ان کو صبح کو پتہ چلا کہ نبی ﷺ تو چلے گئے تو انھوں نے نبی ﷺ کو ڈھونڈنے پر دو سو اونٹوں کا انعام مقرر کیا۔ یہ انعام سن کر مکہ میں کوئی ایسا قبیلہ نہیں تھا، کوئی ایسا خاندان نہیں تھا، کوئی ایسا گھر نہیں تھا کہ جس کا نوجوان تلاش کرنے کے لیے پیچھے نہ نکل پڑا ہو۔ وہ جبلِ ثور پر بھی پہنچ گئے۔ مگر اللہ رب العزت نے اپنے حبیب کی حفاظت فرما دی۔

علما نے لکھا ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت کیسے فرمائی:

وَ اَخْرَجَ اِبْنِ سَعْدٍ وَابْنِ مَرْدَوَیه عَنْ اِبْنِ مَصْعَبْ قال: ادرکت انس بن مالك و زید بن ارقم، و المغیرة بن شعبة فَسَمِعْتُهُمْ یتحدثون اَنَّ النبی لَیْلَةَ الْغَارِ اَمَرَ اللّٰهُ شَجَرَةً فَنَبَتَتْ فِی وَجْهِ النَّبِیِّ فَسَتَرَتْهُ، وَ اَمَرَ الْعَنْكَبُوْتَ فَنَسَجَتْ فِیْ وَجْهِ النَّبِیِّ فَسَتَرَتْهُ وَ اَمَرَ اللّٰهُ حَمَامَتَیْنِ وَحْشِیَّتَیْنِ فَوَقَفَتَا بِفَمِّ الْغَارِ وَاَقْبَلَ فَتْیَانُ قُرَیْشٍ مِنْ كُلِّ بَطْنٍ رَجُلٌ بِعِصِیِّهِمْ وَ اَسْیَافِهِمْ وَ

هَرَاوِيهِمْ حَتّٰى إِذَا كَانُوا مِنَ النَّبِيِّ ﷺ قَدْرَ اَرْبَعِيْنَ ذِرَاعًا فَنَزَلَ بَعْضُهُمْ فَنَظَرَ فِي الْغَارِ فَرَجَعَ إِلَى اَصْحَابِهِ فَقَالُوْا مَا لَكَ لَمْ تَنْظُرْ فِي الْغَارِ؟ فَقَالَ: رَأَيْتُ حَمَامَتَيْنِ بَفَمِّ الْغَارِ فَعَرَفْتُ اِنَّ لَيْسَ فِيْهِ اَحَدٌ فَسَمِعَ النَّبِيُّ مَا قَالَ عَرَفَ اِنَّ اللّٰهَ دَرْئًا عَنْهُ بِهِمَا قَسَمْتُ النَّبِيُّ عَلَيْهِنَّ وَ فَرَضَ جَزَائُهُنَّ وَانْحَدَرْنَ فِي الْحَرَمِ،

فاخرج ذلك الزوج كل شئى فى الحرم

......بیان کرتے ہیں جس رات نبی غار میں روپوش ہوئے اللہ تعالیٰ نے ایک پودے کو حکم دیا، وہ پودا اگ آیا اس نے نبی کے چہرہ انور کو ڈھانپ لیا۔ (غار کے دھانے پر ایک پودا اگ آیا اللہ کے حکم سے) اور اللہ نے مکڑی کو حکم دیا، اس نے غار کے دھانے پر جالا بن دیا اور نبی کو چھپا لیا اور اللہ رب العزت نے جنگلی کبوتر کو حکم دیا کہ وہ غار کے دروازے کے اوپر ہی ٹھہر جائیں چنانچہ غار کے دہانے پر دو جنگلی کبوتر رک گئے) ہر گھر سے تریسٹھ کے نوجوان نکل پڑے اپنے عصا لے کر، اپنی تلواریں لے کر اور اپنے ڈنڈے لے کر، حتیٰ کہ نبی سے چالیس ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا۔ ان میں سے ایک بندہ اپنی سواری سے نیچے اترا اور اس نے غار کے اندر بھی دیکھا۔ جب اس نے دیکھا کہ غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا بھی ہے اور جنگلی کبوتریاں بھی ہیں تو وہ اپنے ساتھیوں کے پاس واپس چلا گیا۔ اس سے ساتھیوں نے پوچھا کیا مسئلہ تھا، تو نے غار کے اندر جھانک کر کیوں نہیں دیکھا۔ وہ کہنے لگا میں نے دو کبوتریوں کو غار کے دہانے بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ لگتا ہے اس غار میں کوئی نہیں۔ اگر کوئی ہوتا تو جنگلی کبوتریاں یہاں نہیں بیٹھتی)۔ نبی نے اس کافر کی وہ باتیں سن لیں جو وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا نبی سمجھ گئے کہ اللہ نے ادھر سے موڑ دیا ہے۔ مکڑی کے جالے کو دنیا میں سب سے کمزور دیوار کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ﴾ (العنکبوت: ۴۱)

بتلا دیا کہ لوگو! جب میں حفاظت کرنے پر آتا ہوں تو سب سے کمزور دیوار اگر میں حائل کر دیتا ہوں تو پوری دنیا کی طاقت بھی اس دیوار کو توڑ نہیں سکتی میں اس سے بھی حفاظت کر کے دکھا دیتا ہوں۔

ابنِ عساکر نے اپنی تاریخ میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے ایک عجیب روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

كَانَ اَبُوْ بَكر مع رسولِ اللهِ فی الغارِ فَعَطِشَ ، فَقَالَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِذْهَبْ اِلٰى صَدْرِ الْغَارِ فَاَشْرَبْ فَانْطَلَقَ اَبُوْ بَكْر ص اِلٰى صدرِ الغَارِ فَشَرِبَ مِنْهُ مَاءٌ اَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ وَ ابْيضَ مِنَ اللّبن وَ اَزْكٰى رَائِحَةً مِنَ الْمِسْكِ ، ثُمَّ عَادَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ الْمَلَكَ الْمُوْكَلَ بِاَنْهَارِ الْجَنَّةِ اَنْ خَرَقَ نَهْرًا مِنْ جَنَّةِ الْفِرْدَوْسِ اِلٰى صَدرِ الْغَارِ لِتَشْرِبَ

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غار میں نبی علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ ان کو پیاس محسوس ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا: غار کے دہانے پر جاؤ۔ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غار کے دہانے پر چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے شہد سے زیادہ میٹھا، دودھ سے زیادہ سفید اور مشک سے زیادہ خوشبودار پانی پیا۔ پھر واپس آ گئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جنت کی نہروں پر مامور فرشتے کو حکم دے دیا کہ وہ تمہارے پینے کے لیے جنت فردوس سے لے کر غار کے دہانے تک ایک نہر کھود دے۔"

اللہ اکبر اللہ تعالیٰ پھر یوں مدد فرماتے ہیں۔

سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ کی مدد بھی عجیب چیز ہے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے احکام پر پابندی کے ساتھ عمل کرنے والے بن جائیں تو جس حال میں بھی ہوں گے ہمارا

پروردگار ہماری مدد فرمائے گا اور وہ پروردگار ہمیں مصیبتوں سے نکال دے گا۔اس لیے آج کا یہ سبق پکا کرلیں کہ نظر کس پر رکھنی ہے؟ اللہ رب العزت کی ذات پر ادھر ادھر سے نگاہیں ہٹالیں اور ایک اللہ رب العزت پر اپنی نگاہوں کو جمالیں۔ان مشکلات میں وہی ہمارے کام آئے گا اور اس کرب اور غم سے وہی ہمیں نجات دلائے گا۔

سچے رب کے سچے وعدے:

اللہ رب العزت قرآن مجید میں ایمان والوں کے ساتھ کچھ وعدے فرماتے ہیں۔امید ہے کہ آپ گوش ہوش کے ساتھ سنیں گے۔

☆......اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

﴿وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَاۤىِٕكُمْ﴾ (النساء:۴۵)

''اور اللہ بہتر جانتا ہے تمہارے دشمنوں کو''

ہم نہیں جانتے کہ ہمارا دشمن کون ہے؟ ہماری نظر میں دوست ہوسکتا ہے،مگر دوستی کے رنگ میں دشمنی کررہا ہوتو دلوں کی نیت کو ہم کیسے جانیں؟

آج کل تو حال بھی یہی ہے۔کفر دوست بن کر دشمنی کرتا ہے،زیادہ قریب ہوکر زیادہ گہرا زخم لگانے کی کوشش کرتا ہے۔اوپر اوپر سے خیر خواہی کررہا ہوتا ہے اور اندر سے جڑیں کاٹ رہا ہوتا ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں،ایمان والو! تمہیں پتہ نہیں ہے تمہارا دوست کون ہے اور دشمن کون ہے؟...... اگلی بات یہ بتائی:

﴿وَ لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا﴾ (النساء:۱۴۱)

اور اللہ تعالیٰ ہرگز ہرگز کافروں کو ایمان والوں تک پہنچنے نہیں دے گا۔اس کی مثال یوں سمجھیے کہ کوئی کسی کے بچے کو مارنا چاہے تو باپ کہتا ہے: میاں تم میری لاش سے گذر کے جاؤ گے بچے کے پاس۔یعنی پہلے مجھ سے نمٹو! پھر میرے بچے کو ہاتھ

لگاؤ! اس آیت کا ترجمہ ہو بہو یہی بنتا ہے۔ کہ ایمان والو! جو تم تک آنا چاہے گا، وہ پہلے مجھ سے نمٹے گا پھر تم تک آئے گا۔ یعنی میں ان کو تم تک آنے ہی نہیں دوں گا، ایک مرغی بچوں کو لے کر پھر رہی ہوتی ہے۔ بلی ادھر آ جاتی ہے، مرغی جانتی ہے کہ میں کمزور ہوں، مگر ممتا کی محبت کی وجہ بلی کیسامنے پر پھیلا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ پر پھیلانے کا کیا مطلب ہے؟ کیا وہ بلی کو مارے گی؟ نہیں نہیں، مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے کچھ کرنا ہی ہے تو پہلے مجھے مارو، پھر میرے بچوں کو ہاتھ لگاؤ۔ جب ماں کی ممتا کا یہ حال ہے تو پھر اللہ کی اپنے ایمان والوں کے ساتھ محبت کا کیا عالم ہوگا۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر کافر تجھ تک آنا چاہیں گے تو میں ان کو آنے ہی نہیں دوں گا۔ ان کے راستہ میں رکاوٹ بن جاؤں گا، ان کا راستہ روک دوں گا تم تک ان کے ہاتھ پہنچ ہی نہیں سکیں گے۔

☆...... پھر اگلی بات ذرا اور وضاحت کے ساتھ فرما دی۔ ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (المؤمن:۵۱)

"بے شک ہمارے ذمے ہے مدد اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی، اس دنیا کی زندگی میں بھی اور اس دن جب گواہیاں دی جائیں گی (یعنی قیامت کے دن)

یہ انا کا لفظ بڑا معنیٰ خیز ہے۔ ترجمہ تو یہی بنتا ہے کہ ہمارے ذمہ ہے مدد اپنے رسولوں کی لیکن سمجھنے کی خاطر ہم اس کا ترجمہ اپنی زبان میں کریں تو یوں بنتا ہے ہم پر فرض ہے، مدد اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی۔ اللہ تعالیٰ پر تو کوئی چیز فرض نہیں، مگر الفاظ کا انداز یہی مفہوم بتا رہا ہے کہ ہم پر لازم ہے مدد اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی۔ یہ دنیا کے کسی وڈیرے کی بات نہیں ہے جو آج وعدہ کرے گا کل کو اس کے خلاف کرے گا یہ تو خدا کی بات ہے۔ یہ مالک الملک کی بات ہے۔ فرما رہے ہیں: ہمارے ذمہ ہے مدد اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی۔

جنگ یرموک میں اللہ کی مدد:

جنگ یرموک میں ایک موقعہ ایسا آیا کہ ایمان والے تعداد میں بہت تھوڑے تھے اور نصاریٰ بہت زیادہ تھے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ سفید گھوڑے کے جسم پر چھوٹا سا کالا سا داغ ہوتا ہے، اس سفیدی کی طرح دشمن تھے اور اس کالے داغ کی مانند مسلمان کی تعداد تھی۔ یہ تھے کوئی پانچ سات ہزار، اور وہ تھے کئی لاکھ کی تعداد میں اور مقابلہ تھا۔

اس موقعہ پر امیرِ لشکر نے حضرت عمرؓ کو خط لکھا کہ ہم بہت تھوڑے ہیں، لہٰذا کچھ فوجی کمک بھیج دیجیے۔ تو عمرؓ نے اس کے جواب میں ایک خط لکھا اور نبی ﷺ کی صحبت کا حق ادا کر دیا۔ خط میں کیا لکھا؟ فرمایا:

قَدْ جَاءَ نِيْ كِتَابُكُمْ تَسْتَمِدُّوْنَنِيْ وَ اِنِّيْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ هُوَ اَعَزُّ نَصْرًا وَ اَحْصَنُ جُنْدًا اَللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ فَاسْتَنْصِرُوْهُ فَاِنَّ مُحَمَّدًا ﷺ قَدْ نُصِرَ فِيْ يَوْمِ بَدْرٍ فِيْ اَقَلَّ مِنْ عِدَتِكُمْ فَاِذَا جَائَكُمْ كِتَابِيْ هٰذَا فَقَاتِلُوْهُمْ وَ لَا تُرَاجِعُوْنِيْ

تمہارا مکتوب مجھے ملا ہے جس میں تم نے مجھ سے مدد طلب کی ہے۔ میں تمہیں اس ذات کے بارے میں بتاتا ہوں (اس کا پتہ دیتا ہوں) جو سب سے زیادہ غالب آنے والی ذات ہے اور سب سے بہترین لشکر رکھنے والی ذات ہے۔ وہ اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ پس تم اسی سے مدد مانگو۔ اور نبی ﷺ میدان بدر میں تھوڑے تھے مگر اللہ نے ان کی مدد فرمائی۔ (لہٰذا تم اسی اللہ پر نظر رکھو) جب یہ مکتوب تم تک پہنچے تو تم ان پر ٹوٹ کر حملہ کر دو اور پھر میری طرف اس سلسلہ میں کوئی مراجعت نہ کرو۔

جیسے ہی حضرت عمرؓ کا خط پہنچا، ایمان والوں نے اگلے دن اکٹھے ہو کر ایسا

شدید حملہ کیا کہ اللہ کی مدد اتر آئی اور اللہ نے مسلمانوں کو جنگ یرموک میں کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ حضرت عمرؓ جانتے تھے کہ یہاں قلت اور کثرت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ اللہ کی مدد کا ہے۔ جس پر لڑنے میں اللہ کی مدد اتر آتی ہے، وہ پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ انھوں نے ہمیں سبق سکھا دیا۔ آج ہمیں بھی ایسا نیک بننے کی ضرورت ہے کہ اللہ کی مدد ہمارے ساتھ آ جائے۔ جب مدد آ گئی تو پھر خیر ہے۔ سینکڑوں سالوں کے مشاہدے غلط ثابت ہو جائیں گے۔ بڑی بڑی سپر پاور کو اللہ تعالیٰ آنکھوں کے سامنے صفر پاور بنا دیں گے یہ ایمان بڑی مضبوط چیز ہے۔

غزوہ بدر میں اللہ کی مدد:

اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر میں بھی صحابہ کرام کی مدد فرمائی۔ وہ کیسے؟ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ (ال عمران:۱۲۳)

''تحقیق اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی اور تم تو کمزور تھے''

دو تلواریں اور ستر گھوڑے اور بعض کے ہاتھوں میں درختوں کی ٹہنیاں تھی اور ایک ہزار کے مقابلے میں تین سو تیرہ اصحاب خالی ہاتھ آ کر کھڑے ہو گئے۔ صحابہ کی جب نظر پڑی تو ان کو لگتا تھا کہ ہمیں تو موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں گواہی دے رہے ہیں:

﴿ كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴾ (الانفال:٦)

صحابہ کو اپنی آنکھوں سے موت نظر آ رہی تھی۔ اب سوچیں کہ ایسی موت میں بندے کا کیا حال ہوتا ہے مگر اس وقت اللہ کے پیارے حبیب نے اللہ رب عزت

سے مدد مانگی۔آپ نے قلت اور کثرت کو نہیں دیکھا۔آپ نے اسباب پر نظر نہیں دوڑائی کہ وہ لوگ لوہے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

......زرہیں پہنی ہوئی

......خود پہنے ہوئے ہیں

......تلواریں ہاتھ میں ہیں

......نیزے ہیں

.... گرز ہیں

اللہ کے نبی ﷺ نے اللہ کی مدد پر نظر رکھی۔ چنانچہ بدر کی رات میں نبی ﷺ نے اللہ کے سامنے تہجد کے بعد دعا مانگی۔حضرت ابوبکر صدیق آپ کے خیمے کے باہر سیکورٹی گارڈ کی ڈیوٹی دے رہے تھے۔آپ نے دعا مانگتے ہوئے فرمایا:

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ وَهُوَ فِي قُبَّةٍ

((اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَنْشُدُكَ عَهْدَكَ وَ وَعْدَكَ))

"اے اللہ! میں آپ کو آپ کے عہد اور آپ کے وعدے کا واسطہ دیتا ہوں"

دیکھا اللہ نے وعدہ کیا ہوا تھا کہ میں مدد کروں گا،اس لیے اللہ کے نبی نے فرمایا: کہ اے اللہ! میں آپ کو آپ کے عہد اور آپ کے وعدے کا واسطہ دیتا ہوں۔

اس سے آگے عرض کیا:

((اَللّٰهُمَّ اِنْ شِئْتَ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ))

"اے اللہ! اگر تو چاہے کہ کفار ہمیں مٹا دیں تو پھر آج کے بعد دنیا میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا"

مرضی تو آپ کی چلنی ہے نا۔

آگے فرماتے ہیں:

فَاَخَذَ اَبُوْ بَكْرٍ بِيَدِهٖ فَقَالَ: حَسْبُكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ،فَقَدْ اَلْحَحْتَ عَلٰى رَبِّكَ

(جب نبی نے یہ دعا مانگی) تو صدیق اکبر آگے بڑھے اور نبی کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

''اے اللہ کے رسول ﷺ آپ کے لیے یہ دعا کافی ہے، آپ نے اپنے رب سے اصرار کے ساتھ مانگنے کی انتہا کر دی ہے''

کیا عجیب دعا مانگی ہے آپ نے: یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یقین آ گیا کہ اب اللہ کی مدد اتر کر رہے گی۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا کہ جب دن ہوا تو

﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ (القمر:۴۵)

''وہ جماعت شکست کھا گئی اور پیٹھ پھیر کر بھاگ گئی''

اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی اس وقت اپنی مدد سے فتح عطا فرما دی۔

شاہنامۂ اسلام:

حنیف جالندھری نے شاہنامۂ اسلام لکھا ہے۔ وہ نوجوان کے پڑھنے کی چیز ہے۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نبی ﷺ کی معیت میں میدانِ بدر میں پہنچے تو اس وقت وہاں کے پہاڑ کی کیا حالت تھی۔ حنیف جالندھری نے ذرا شاعرانہ انداز میں اس کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ تشنہ لب جماعت جب یہاں پر رک گئی آ کر
دعا کی دامن صحرا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر
کہ اے صحرا کو آتشناک چہرہ بخشنے والے
رخِ خورشید کو کرنوں کا سہرا بخشنے والے
ازل کے دن سے اب تک بھاڑ میں بھنتا رہا ہوں میں

صدائے رعدِ باراں دور سے سنتا رہا ہوں میں
ہوا ہوں جب سے پیدا جان پانی کو ترستی ہے
میرے سینے کے اوپر آگ کی بدلی برستی ہے
میں سمجھتا ہوں مقدر ہو چکی ہے دھوپ کی سختی
میری قسمت میں لکھی جا چکی ہے سوختہ بختی
بنایا رفتہ رفتہ میں نے بھی مزاج اپنا
لیا ہر آبلہ پا سے زبردستی خراج اپنا
خبر کیا تھی یا الٰہی! اک دن ایسا بھی آئے گا
کہ تیرا ساقیِ کوثر یہاں تشریف لائے گا
اگر یہ بات پہلے سے معلوم ہو جاتی
میرے دل کی کدورت خود بخود معدوم ہو جاتی
خبر کیا تھی تیرے نمازی یہاں آکے ٹھہریں گے
شہید آرام فرمائیں گے غازی آکر ٹھہریں گے
خبر کیا تھی ملے گی یہ سعادت میرے دامن کو
بنایا جائے گا فرشِ سعادت میرے دامن کو
خبر ہوتی میں شبنم کے قطرے جمع کر رکھتا
چھپا کر ایک گوشے میں مصفا حوض بھر رکھتا
وہ پانی ان مقدس مہمانوں کو پلا دیتا
میں اپنی تشنگیِ دیدار حضرت سے بجھالیتا
مرے سر پر سے گذرا نوح کے طوفاں کا پانی
تاسف ہے کہ مجھ سے ہو گئی اس وقت نادانی

اگر میں رکھتا اس پانی کی تھوڑی سی خبرداری
تو ہو جا میری آنکھوں سے چشموں کی طرح جاری
یہ ستر اونٹ دو گھوڑے یہاں سیراب ہو جاتے
مجاہد بھی وضو کرتے نہاتے غسل فرماتے
تیرے محبوب کے پیارے قدم اس خاک پر آئے
الٰہی حکم دے سورج کو اب آگ نہ برسائے
اگر اب میرے دامن سے ہوائے گرم آئے گی
تو مجھ کو رحمت للعالمین سے شرم آئے گی
جلیل الشان مہمانوں کا صدقہ مہربانی کر
عطا بہر وضو ان کے لیے تھوڑا سا پانی کر
برائے چند ساعت ابر باراں بھیج دے یا رب
بہاراں بھیج دے یا رب! بہاراں بھیج دے یا رب!
حضور ساقی کوثر میری کچھ لاج رہ جاتی
مری عزت میری شرم آج رہ جاتی

گویا کہ پہاڑ بھی یہ فریاد کر رہا ہے کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑ جائے کہ میرے پاس تو خشکی کے سوا کچھ نہیں ...... اللہ رب العزت نے اگلے دن بارش عطا فرما دی ...... تو دیکھیے کہ بدر کے پہاڑوں کا کیا حال ہے۔ پھر اللہ رب العزت نے وہاں پر فرشتوں کو اتارا اور اپنے محبوب کی مدد کا وعدہ پورا فرما دیا۔

اگر اللہ رب العزت وہاں پر پہنچائے اور دیکھنے والا دیکھے تو عجیب منظر نظر آتا ہے۔ ایک وہ پہاڑ ہے جس پر فرشتے نازل ہوئے اور ایک وہ پہاڑ جس کی طرف اللہ کے پیارے حبیب تھے اور دوسرا وہ کھلی جگہ جس کی طرف قریشِ مکہ تھے۔ ان کو اپنی

طاقت پر بڑا ناز تھا۔ بالآخر اللہ رب العزت نے ایسی مدد فرمائی کہ ایمان والوں کو کامیابی عطا فرما دی، اور یہ کامیابی فقط اللہ رب العزت کی مدد سے ممکن ہوئی۔ اگر ہم بھی آج اللہ رب العزت کے وعدوں پر بھروسہ کریں گے تو اللہ رب العزت ہماری مدد پر بھی اسی طرح قادر ہے جس طرح اس نے اپنے انبیا کی اور ایمان والے صحابہ کی مدد فرمائی۔

غزوہ احزاب میں اللہ تعالیٰ کی مدد:

قریشِ مکہ نے صحابۂ کرام کی جماعت کے بارے میں سوچا کہ یہ ایک چھوٹی سی جماعت ہے، ہم سب مل کر جاتے ہیں اور جا کر ایک ہی وقت میں ان کا قصہ ہی تمام کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ سارے قبائل کو لے کر آ گئے اور مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ یوں سمجھ لیں کہ پوری دنیا کو لے کر آ گئے۔ اس کو غزوہ احزاب کہتے ہیں۔ اس وقت لوگ دیکھتے تھے تو کہتے تھے:

﴿إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ﴾ (ال عمران:۱۷۳)

''لوگ تمھارے لیے جمع ہو کر آ گئے ہیں، لہٰذا تم ان سے ڈرو''

لیکن وہ ایسی جماعت تھی کہ

﴿فَزَادَهُمْ إِيْمَانًا﴾ (ال عمران:۱۷۳)

''اس بات کو سن کر ایمان والوں کا ایمان بڑھ گیا''

دیکھو! آج کے حالات کو غزوۂ احزاب پر ذرا منطبق کر لو۔ اس وقت بھی قریش پوری دنیا کی سپورٹ لے کر ایمان والوں کو ختم کرنے کے لیے آ گئے تھے اور یہی یہودی ڈراتے تھے کہ

﴿إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ﴾ (ال عمران:۱۷۳)

سارے انسان تمھارے لیے جمع ہو کر آ گئے ہیں، بھئی! ڈرو کچھ فکر کرو۔ لیکن یہ سن کر ایمان والوں کا ایمان بڑھ جاتا تھا۔ اس لیے کہ ان کو یقین تھا کہ اللہ کی مدد ہمارے ساتھ ہے۔ اور وہ کیا کہتے تھے؟

﴿قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ (ال عمران:۱۷۳)

آج بھی کفار مسلمانوں کو صفۂ ہستی سے ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور غزوۂ احزاب کی طرح سب متحد ہو کر، ایک اتحادی قوت بن کر میدان میں اترے ہوئے ہیں۔ اگر آج ہم بھی اللہ کی ذات پر یقین پختہ کر لیں تو یہ کفار ہمارا ایک بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ حالات جیسے بھی ہوں ہمیں اللہ پر نظر رکھنی چاہیے۔

''اللہ بس...... باقی ہوس''

ہمیں ایک اللہ کافی ہے:

کوشش یہ کرنی چاہیے کہ ہم اپنے گناہوں سے توبہ کر کے اپنے پروردگار کو راضی کر لیں۔ جب وہ پروردگار راضی ہو گیا اور اس نے ہماری مدد کا ارادہ فرما لیا تو یاد رکھنا! ایمان والوں کو دنیا سے کوئی بھی ختم نہیں کر سکے گا۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ﴾

(ال عمران:۱۷۴)

''یہ (ایمان والے) لوٹے اللہ کی مدد کے ساتھ اور ایسے فضل کے ساتھ کہ ان کو مس نہیں کیا برائی نے''

﴿وَ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ، وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ﴾

(ال عمران:۱۷۴)

اب آگے اللہ تعالیٰ ایک بات سمجھاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا ذَالِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَائَهُ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِيْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۷۵)

''یہ شیطان جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، تم ان سے مت ڈرنا ایک مجھ سے ڈرنا اگر تم ایمان والے ہو''

تو ہمیں کس سے ڈرنا ہے؟ ایک اللہ رب العزت سے ڈرنا ہے۔

اللہ کے فیصلے:

ایک حدیث پاک میں نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے یہ بات سمجھائی۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں سواری پر نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے پیچھے سوار تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((يَا غُلَامُ اِنِّيْ اُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ: اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ اللّٰهُ، اِحْفَظَ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ ، اِذَا سَئَلْتَ فَاسْأَ لِ اللّٰهَ ، وَ اِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ ،وَ اعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَنْفَعُكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ ،وَلَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ ، رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَ جَفَّتِ الصُّحُفِ))

''اے لڑکے میں تمہیں چند باتیں سکھاتا ہوں۔ تو اللہ کی حفاظت کر اللہ تیری حفاظت کرے گا (یعنی تو اللہ کا دھیان رکھ اللہ تیری حفاظت کریں گے) تو اللہ کی بات کو مان، تو اللہ کو اپنے سامنے پائے گا۔ جب تم نے مانگنا ہو تو اللہ سے مانگو! اگر مدد مانگنی ہے تو اللہ سے مدد مانگو! جان لو! اگر ساری مخلوق تجھے نفع

دینے کے لیے اکٹھی ہو جائے تو وہ وہی نفع پہنچا سکے گی جو اللہ نے لکھا ہوا ہو گا۔اور اگر ساری مخلوق تجھے نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے تو تمہیں ضرر نہیں پہنچا سکتی مگر وہی جو اللہ نے لکھ دیا۔قلم اٹھالی گئی ہے اور صحیفے کی سیاہی خشک ہو چکی ہے۔''

یعنی جو کچھ اللہ نے لکھنا تھا وہ لکھا جا چکا ہے۔لہٰذا اب پوری دنیا مل کر نہ تو تمہیں نفع دے سکتی ہے اور نہ ہی نقصان دے سکتی ،اگر کچھ ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔اس لیے اگر ہمیں مدد مانگنی ہے تو کس سے مانگنی ہے؟ اپنے پروردگار سے مانگنی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا طریقہ:

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارے اوپر تو آپ کے آنے سے پہلے بھی مصیبت تھی اور آپ کے آنے کے بعد بھی۔

﴿اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا﴾ (الاعراف:۱۲۹)

تو حضرت موسیٰ نے اس کے جواب میں کیا کہا تھا؟

﴿قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا﴾ (الاعراف:۱۲۹)

''موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: اللہ سے مدد مانگو اور صبر اختیار کرو''

دو باتیں کہی جا رہی ہیں۔اللہ سے مدد مانگو اور صبر اختیار کرو۔چنانچہ جب قوم نے صبر کیا اللہ سے مدد مانگی تو اللہ رب العزت نے مدد کر دی ،ہمیں بھی یہی حکم دیا گیا ......قرآن عظیم الشان ......اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ﴾ (البقرۃ:۱۵۳)

''اور مدد مانگو،صبر کے ساتھ اور نماز کے ساتھ''

سبحان اللہ! ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کی مدد مانگنے کا طریقہ کیا ہے۔پہلی بات

ارشاد فرمائی کہ اپنے اندر صبر وضبط پیدا کرو اور دوسری بات یہ بتائی کہ نماز کے ذریعے مدد مانگو۔ سبحان اللہ! اللہ کے پیارے حبیب ﷺ امت کے لیے تیئیس سال روتے رہے...... کوئی ماں اپنے بچے کے لیے تیئیس سال نہیں روئی کوئی باپ بیٹے لیے تیئیس سال نہیں رویا ہوگا...... میرے آقا امت کے لیے تیئیس سال روتے رہے۔ تیئیس سال رونے کے بعد اللہ کے حبیب امت کو بے یارو مددگار چھوڑ کر نہیں چلے گئے۔ بلکہ اس امت کو نماز کے ذریعے اللہ سے مانگنے کا طریقہ سکھا کر گئے کہ اگر میرے جانے بعد تم پر کوئی ایسا وقت آجائے تو تم اس وقت نماز کے ذریعے سے اپنے رب سے مانگنا۔ جب کسی دفتر سے کام کروانا ہوتا ہے تو Application (درخواست) بھرنی پڑتی ہے۔

......حج پہ جانا ہے، اپلیکیشن بھرو!

......ویزہ لینا ہے، اپلیکیشن بھرو!

اسی طرح

......اللہ سے مدد مانگنی ہے، اپلیکیشن بھرو!

اس اپلیکیشن کا نام نماز ہے۔ ہمارے اسلاف کا یہ طریقہ تھا کہ جب کسی پر مصیبت آتی تھی تو وضو کر کے دو رکعت نفل پڑھا کرتے تھے پھر اللہ سے دعا مانگتے تھے۔

جی ہاں! یہ دو رکعت نفل پڑھ کر اللہ سے دعا مانگنا۔ ایک طریقہ ہے۔ کاش! ان حالات میں ہم اس کو اپنی زندگی کا ایک حصہ بنالیں ہماری کوئی رات تہجد کی چند رکعتوں کے بغیر نہ گذرے۔ ہم اللہ سے اٹھ کر مانگیں کہ اللہ! اپنی مدد عطا کر دیجیے۔

فجر کی سنتوں پر تین انعام:

واقعی! نماز کے ذریعے اللہ کی مدد اترتی ہے۔ فتاوی تاتارخانیہ میں لکھا ہے جو

شخص فجر کی سنتیں گھر پڑھ کر مسجد میں جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تین انعام عطا فرماتا ہے......ایک تو فجر کی سنتیں خود "سنتیں" ہیں اور ان کو گھر سے پڑھ کر مسجد جانا الگ سنت ہے......جو بندہ اس سنت پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو تین انعامات عطا فرماتا ہے۔ایک تو اس گھر کے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔آج دیکھو تو شاید نوے فیصد لوگ کہیں گے کہ گھر کی مصیبتیں ہیں۔

......اولاد کی نافرمانی

......بیوی کی پریشانی

......گھر کے تقاضے پورے نہیں ہوتے

......میاں بیوی کے درمیان نہیں بنتی۔

پہلا انعام یہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ان پریشانیوں سے نجات عطا فرما دیتے ہیں۔جو بندہ فجر کی سنتیں گھر میں پڑھ کر مسجد میں جائے گا اللہ تعالیٰ اس کو دوسرا انعام یہ دیتے ہیں کہ اس بندے کے رزق میں اللہ تعالیٰ کشادگی عطا فرما دیتے ہیں، یعنی

......جاب اور بزنس کے مسئلے ختم

......کارخانوں کے مسئلے ختم

......مارکیٹ کے مسئلے ختم

......قرضوں کے مسئلے ختم، اور

......رزق کی کشادگی

تیسرا انعام سب سے بڑا انعام ہے کہ اللہ تعالیٰ موت کے وقت ایمان کی سلامتی کے ساتھ دنیا سے جانے کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔یہاں سے اندازہ کیجیے کہ کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے حبیب نے کیا کیا پیاری باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔عمل کرنا تو ہمارے ذمے ہے نا۔ہم اگر عمل کریں تو یہ نعمتیں ہمیں مل سکتی ہیں۔

پورا دن اللہ کی مدد حاصل کرنے کا عمل:

مسلم شریف کی روایت ہے۔ یہ حدیثِ قدسی ہے، حدیثِ قدسی کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں،...... ابو درداؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

((یَا بْنَ آدَمَ لَا تَعْجِزْ عَنْ اَرْبَعِ رَكَعَاتٍ مِنْ اَوَّلِ النَّهَارِ اَكْفِكَ آخِرَهُ))

''اے آدم کی اولاد! تو دن کے شروع میں (یعنی فجر کی) چار رکعت پڑھ لیا کر، (اس کی برکت سے) میں سارا دن تیرے کاموں میں تیری مدد کروں گا''

اب بتائیں کہ فجر کی نماز کتنے لوگ پڑھتے ہیں؟ آج جمعہ کی نماز میں جتنے مسلمان مسجد میں آئے ہیں، اتنے مسلمان اگر فجر کی نماز میں مسجد میں آنے لگ جائیں تو یہ عاجز گمان کرتا ہے کہ اللہ کی مدد اتر آئے گی۔ تو فرمایا کہ دن کے شروع میں چار رکعتیں پڑھ لیا کر، میں سارا دن تیرے کاموں میں تیری مدد کروں گا۔

قرب بالفرائض:

یہ نماز ایک عجیب نعمت ہے۔ یہ بندے کو اللہ سے ملا دیتی ہے۔ بلکہ بندے کو اللہ کا محبوب بنا دیتی ہے۔ سنیے! ابن سنّی نے ام میمونہ سے یہ حدیث روایت کی ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

((مَا تَقَرَّبَ اِلَى الْعَبْدِ بِمِثْلِ اَدَاءِ فَرَائِضِيْ))

''میرا بندہ میرا اتنا تقرب نہیں پا سکتا جتنا کہ فرض ادا کرنے سے تقرب پا سکتا ہے''

اس کو کہتے ہیں ''قرب بالفرائض''۔ یعنی فرائض پر عمل کرنے سے انسان اللہ

کے قریب ہو جاتا ہے۔ اور اس کے پیارے بندوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ فرائض ادا کرنے پر اتنا قرب ملتا ہے۔

قرب بالنوافل:

اور جو نفل پڑھے، وہ Cherry upon the cake ''چیری اپاؤن دا کیک'' کی مانند ہوتا ہے۔ جیسے کیک کے اوپر میٹھی میٹھی مزے دار کریم رکھتے ہیں اسی طرح وہ نفل اللہ تعالیٰ کو اتنے ہی پیارے اور اچھے لگتے ہیں۔ دستور کی بات بھی یہی ہے کہ جو بندہ Extra (اضافی) ٹائم میں اپنے مالک کا کام کرے تو وہ پیارا لگتا ہے۔ گھر کا خادم اگر آتے ہوئے شہد کی بوتل لے آئے اور کہے: جی! راستے میں خالص شہد مل رہا تھا، میں نے سوچا کہ میں آپ کے لیے لے آتا ہوں، اب اس کا یہ ڈیوٹی ٹائم تو نہیں تھا، اس نے اپنے ٹائم میں سے پانچ منٹ کے لیے رک کے شہد خریدا۔ مالک اس کو پیسے بھی دے گا اور ساتھ محبت بھی بڑھے گی کہ اس نے میرا خیال رکھا اور اضافی وقت میں میرا کام کیا۔ اس سے پتہ چلا کہ ایکسٹرا ٹائم لگانا خوشی کا باعث بنتا ہے۔ یہ نفل بھی ایکسٹرا ٹائم کا کام ہے فرائض نہیں ہیں۔ اس لیے نفل پڑھنے والے سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس حدیث قدسی میں آگے فرماتے ہیں:

((وَ اِنَّہٗ لَیَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ))

''اور وہ نوافل کے ذریعے اتنا میرے قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس بندے سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں''

ہمارے دل میں بھی تمنا ہونی چاہیے کہ ہم بھی اللہ کی نظر میں محبوب بن جائیں پھر وہ محبوب بھی کیسا بنتا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

((فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ رِجْلَہُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِھَا))

''پھر جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی ٹانگیں بن جاتا ہوں جن

سے وہ چلتا ہے‘‘

((وَ يَدَهُ الَّتِىْ يَبْطِشُ بِهَا))

’’اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے‘‘

((وَ لِسَانَهُ الَّذِىْ يَنْطِقُ بِهٖ))

’’اور اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے‘‘

((وَ قَلْبَهُ الَّذِىْ يَعْقِلُ بِهٖ))

’’اور اس کا دل بن جاتا ہوں جس سے کہ وہ سوچتا ہے‘‘

اسی طرح کی ایک حدیث بخاری شریف میں بھی الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ ہے۔اس کا بھی یہی مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: کہ

......میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں

......زبان بن جاتا ہوں

......ہاتھ بن جاتا ہوں

......پاؤں بن جاتا ہوں

یا اللہ! آپ فرما رہے ہیں !!! مالک الملک، احکم الحاکمین، ربّ العالمین اپنے بندے کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ میں اس کے اعضا بن جاتا ہوں۔ اللہ اکبر کبیرا صرف یہی نہیں کہ یہ بات ہی بات ہے بلکہ یہ سچ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سچ کر دکھایا۔ جب نبی نے ریت پھینکی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ (الانفال: ۱۷)

’’اور آپ نے نہیں پھینکا جب آپ پھینک رہے تھے، وہ تو اللہ پھینک رہا تھا‘‘

یا اللہ! آپ اتنے بڑے ہیں اور بندے کے ساتھ اتنا احسان فرماتے ہیں !!! کہ اگر وہ آپ کے حکم کی پیروی کر لیتا ہے اور استقامت کے ساتھ جما رہتا ہے تو

آپ اس کو اتنی شان سے نواز دیتے ہیں!! اسی پر تو کہنے والے نے کہا:

گفتہ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

وہ بندے کے گلے سے بات نکل رہی تھی مگر حقیقت میں ان کا بولنا اللہ کا بولنا تھا، یہی تو ہمیں یہ حدیث پاک سکھا رہی ہے کہ پھر مومن کو اللہ تعالیٰ کیا مقام عطا فرما دیتے ہیں۔ اسی حدیث پاک میں آگے فرماتے:

((اِنْ سَاَلَنِی اَعْطَیْتُهٗ))

''اگر (وہ بندہ) مجھ سوال کرتا ہے تو میں اس بندہ کے سوال کو پورا کر دیتا ہوں''

((وَ اِنْ دَعَانِی اَجَبْتُهٗ))

''اور اگر وہ مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا کو قبول کر لیتا ہوں''

بھئی! ایگریمنٹ تو سامنے ہے:

......اللہ تعالیٰ مدد کے لیے بھی تیار

......دعا قبول کرنے کے لیے بھی تیار

......جو مانگے، اسے دینے کے لیے بھی تیار

تو پھر پیچھے رہ تو ہمارا ہی کام گیا ہے نا کہ ہم اللہ سے مانگنے والے بن جائیں۔

پھر پیچھے کون ہٹا؟

ایک مرتبہ یہ عاجز ایک ملک میں جا رہا تھا۔ وہاں ایک دیوار پر ایک عجیب فقرہ لکھا ہوا دیکھا۔ میں کافی دیر تک اس کو پڑھتا رہا۔ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ مگر لکھنے والے نے عجیب بات لکھ ڈالی تھی۔ لکھا ہوا تھا:

If you feel God is away, guess who moved

''اگر تم محسوس کرتے ہو کہ اللہ دور ہے تو یہ اندازہ لگاؤ کہ پیچھے کون ہٹا''

واقعی اللہ تعالیٰ تو اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔تو پھر پیچھے کون ہٹتا ہے؟ بندہ خود ہٹتا ہے۔اگر ہم سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک اللہ رب العزت کے حکموں پر عمل کرنے والے بن جائیں تو اللہ تعالیٰ اس ایگری منٹ کے مطابق بندے کو یہ نعمتیں عطا فرما دیں گے۔یہ دنیا میں کامیابی اور غلبہ حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ ہے۔

اے رب کا راستہ بھولنے والے! سن ذرا......!

اگر انسان اللہ کے در کا راستہ بھول جائے اور رخ پھیر لے تو ایک حدیث قدسی میں اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

((اِبْنِ آدَمَ تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِیْ اَمْلَاءُ صَدْرَكَ غِنًی وَ اَسُدُّ فَقْرَكَ))

''اے ابن آدم! تو میری عبادت کے لیے اپنے آپ کو فارغ کر لے میں تیرے سینے کو غنا سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو روک دوں گا''

((وَ اِلَّا تَفْعَلْ مَلَاْتُ صَدْرَكَ شُغْلًا وَ لَمْ اَسُدَّ فَقْرَكَ))

اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو میں تیرے سینے کو کاموں سے بھر دوں گا اور تمہارا فقر نہیں روکوں گا۔ایک کام ختم نہیں ہوگا کہ دوسرا کام دل میں ڈال دوں گا اور دوسرا ختم نہیں ہوگا کہ تیسرا کام دل میں ڈال دوں گا۔جیسا کہ آج کل ہم پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔اور آگے فرمایا کہ تمہارے فقر کو روکوں گا نہیں۔اتنا کمائیں گے کہ تھک ہار کر رہ جائیں گے مگر خرچے پورے نہیں ہوں گے۔یہی وجہ ہے کہ آج گھر کے سب لوگ نوکریاں کر رہے ہوتے ہیں لیکن خرچے پھر بھی پورے نہیں ہوتے۔ جس کو دیکھو اسی کو گلہ کہ خرچے پورے نہیں ہوتے۔تو پھر ان خرچوں کو تو اللہ ہی پورا فرمائے۔

کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ:

ہمارے پاس کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اپنی نگاہیں مخلوق سے ہٹائیں اور اللہ کی ذات پر جمادیں اور یوں کہیں:

''حَسْبُنَا اللّٰهُ'' ''ہمارے لیے اللہ کافی ہے''

اس لفظ کو سوچیے گا۔ یہ ہم بہت بڑی بات کر رہے ہیں۔ ہمارے لیے اللہ کافی ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾ (النساء:۸۱)

''اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھو اور اللہ کارساز کافی ہے''

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ (الطلاق:۱۲۹)

''جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہوتا ہے''

ایک اور جگہ پر فرمایا:

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (المائدہ:۳۳)

''اللہ ہی پر توکل کرو اگر تم مومن ہو''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (ھود:۱۲۳)

''تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں سو اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ کرو''

ہمیں بار بار کہا گیا ہے کہ

......اللہ پر توکل کرو

......اللہ کی طرف دھیان کرو

......اللہ پہ نظریں جماؤ

اللہ کا دوست بننے کا فائدہ:

جو بندہ اللہ تعالیٰ کا دوست بنتا ہے پھر اللہ رب العزت اس کا معاملہ خود سمیٹتا ہے اس سلسلے میں بھی حدیث پاک سن لیجیے۔فرمایا:

((مَنْ عَادَ لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتَهٗ بِالْحَرْبِ))

''جس نے میرے ولی سے دشمنی کی میرا اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے''

غور کیجیے کہ اللہ کا دوست بننے کا فائدہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا اس بندے کے ساتھ اعلان جنگ ہے جو میرے ولی سے دشمنی کرتا ہے۔اللہ اکبر کبیرا واقعی! اللہ رب العزت نے اپنا یہ وعدہ سچ کر دکھایا۔بدر میں صحابہ سمجھتے تھے کہ ہم نے کافروں کو قتل کیا مگر اللہ تعالیٰ نے بات ہی صاف کر دی۔فرمایا

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ﴾ (الانفال:١٧)

میرے مالک تیری عظمت پہ قربان جائیں، آپ اپنے قول کے کتنے سچے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تم نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ ان کو تو اللہ نے قتل کیا ہے۔تو بھئی! اگر ہم اپنے اللہ پر نظریں جمائیں گے تو وہ ہمارے الٹے کاموں کو سیدھا کر دیں گے۔ہماری مشکلات کو آسان کر دیں گے اور ہمیں اللہ تعالیٰ مصیبتوں سے محفوظ فرما دیں گے۔اسی لیے ہمیں اکثر و بیشتر کہنا چاہیے:

﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ﴾

ایک وجد آفرین کلام:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ایک بات بڑے عجیب انداز میں ارشاد فرماتے ہیں

ارشاد فرمایا:!

﴿اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ﴾

کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟

یہ آیت پڑھتے ہیں نا تو دل کو کچھ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے۔ مفسرین نے فرمایا: کہنے کا مقصود یہ تھا:

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عِبَادِہٖ

کیا اللہ اپنے ہر بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟

جب ہم نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھ لی تو ہم کیا کہیں؟

ہم کہیں: ''ہمارے لیے اللہ کافی ہے''

دس کلمات پڑھنے والے کے لیے اللہ کافی ہے:

اب ذرا ایک حدیث مبارکہ سن لیجیے۔ کیونکہ آج کل کے حالات میں پریشان حال لوگ کہتے ہیں کہ جی! کچھ پڑھنے کے لیے بتا دیں لہٰذا پڑھنے کی بات بھی سن لیجیے۔ درمنثور میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ دس کلمات پڑھنے والے کے لیے اللہ کافی ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے پانچ باتیں دنیا سے متعلق ہے اور پانچ باتیں آخرت سے متعلق ہیں۔ آپ ان دس باتوں کو یاد کر لیں۔ ایک بات بھی روزیاد کریں تو دس دنوں میں حدیث پاک یاد ہو جائے گی۔ پھر آپ اس حدیث پاک کو اپنی دعاؤں کا حصہ بنالیں۔ جب آپ ان فقروں کو پڑھیں گے تو اللہ آپ کے کاموں کو کفایت فرمادیں گے۔

(۱)...... حَسْبِیَ اللّٰہُ لِدِیْنِیْ

میرے دین کے لیے میرا اللہ کافی ہے

یعنی دین میں کوئی فتنہ وفساد نہ آجائے ۔یادرکھیں دین میں فتنے دوطرح سے آتے ہیں۔ایک شبہات کی وجہ سے ایک شہوات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں ان دونوں قسم کے فتنوں سے محفوظ فرمائے۔ ہمارا دین سلامت رہے۔

(۲)......حَسْبِیَ اللّٰہُ لِمَا اَھَمَّنِیْ

''میرا اللہ کافی ہے ہراس چیز کے لیے جو مجھے پریشان کرتی ہے''

بندہ پریشان کرتا ہے،کوئی چیز پریشان کرتی ہے، کاروبار پریشان کرتا ہے، جو چیز بھی ٹف ٹائم دے رہی ہے، میرا اللہ اس کے لیے کافی ہے۔

(۳)......حَسْبِیَ اللّٰہُ لِمَنْ بَغٰی عَلٰی

''میرا اللہ کافی ہراس کے لیے جو مجھ پر سرکشی کرے''

یعنی چڑھ دوڑے۔ چنانچہ اگر ہمارے اوپر کوئی چڑھ دوڑنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اللہ کافی ہوجائے گا۔

(۴)......حَسْبِیَ اللّٰہُ لِمَنْ حَسَدَنِیْ

''میرا اللہ کافی ہے ہراس کے لیے جو مجھ سے حسد کرتا ہے''

دفتروں کی زندگیوں میں بہت حسد ہوتا ہے۔leg pulling (ٹانگیں کھینچی جاتی ہیں) اس کے پڑھنے سے اللہ تعالیٰ سب حاسدوں سے بندے کو نجات عطا فرما دیتے ہیں۔

(۵)......حَسْبِیَ اللّٰہُ لِمَنْ کَادَنِیْ بِسُوْءٍ

''میرا اللہ کافی ہے ہراس کے لیے جو میرے لیے برے منصوبے بناتا ہے''

اب برے منصوبے بنانے والا کوئی بھی ہوسکتا ہے۔کوئی بندہ ہوسکتا ہے کوئی جماعت ہوسکتی ہے۔ایمان والوں کے خلاف کوئی ملک منصوبے بنا رہا ہے۔ جو مرضی بنا رہا ہے اللہ ان سب کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔

یہ پانچ باتیں دنیا کے لیے ہوگئیں۔ اب پانچ باتیں آخرت کے لیے سن لیجیے۔

(۱)......حَسْبِیَ اللّٰہُ عِنْدَ الْمَوْتِ

''میرا اللہ کافی ہے موت کے وقت''

موت کا لمحہ انسان کی زندگی کا سب سے نازک لمحہ ہوتا ہے۔

(۲)......حَسْبِیَ اللّٰہُ عِنْدَ الْمَسْئَلَةِ الْقَبْرِ

''میرا اللہ کافی ہے قبر کے سوال کے وقت میں''

(۳)......حَسْبِیَ اللّٰہُ عِنْدَ الْمِیْزَانِ

''میرا اللہ کافی ہے جب میزان پر اعمال تولے جائیں گے''

(۴)...... حَسْبِیَ اللّٰہُ عِنْدَ الصِّرَاطِ

''میرا اللہ کافی ہے پل صراط سے گذرنے کے وقت''

(۵)......حَسْبِیَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَ اِلَیْہِ اُنِیْب

اگر یہ دس فقرے ہم ہر نماز کے بعد پڑھ لیں تو ہمارا پروردگار ہمارے دنیا اور آخرت کے مسائل کے لیے کافی ہو جائے گا

میرے لیے یہی عزت کافی ہے:

سیدنا علی کرم اللہ وجہ ایک عجیب بات فرماتے تھے:

''اے اللہ! میرے لیے یہ عزت کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے اور میرے لیے یہی فخر کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں''۔

اللہ اکبر کبیرا،

رب سے اپنا رشتہ جوڑ:

ہمیں بھی اسی طرح اپنی نظریں ہر طرف سے ہٹا کر اپنے پروردگار کے اوپر جما

لینی چاہئیں۔ پھر دیکھیے اللہ رب العزت اپنے وعدوں کو کیسے پورا فرماتے ہیں۔ کہنے والے نے کہا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه
لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه
جھوٹی دنیا سے منہ موڑ
رب سے اپنا رشتہ جوڑ
کون ہے تیرا اس کے سوا
لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه
لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

بچپن کا سبق:

ہمارے اسلاف یہ پیغام چھوٹے بچے کو لوری دے کر شروع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ پرانے وقتوں کی مائیں بچوں کو سلانے کے لیے لوری دیتے ہوئے کہتی تھیں:

حَسْبِیْ رَبِّی جَلَّ اللّٰه
مَا فِی قَلْبِیْ غَیْرُ اللّٰه
نُوْرِ مُحَمَّدْ صَلَّی اللّٰه
لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

یہ حسبی ربی ہمارا بچپن کا سبق تھا۔ اللہ رب العزت ہمارے دنیا اور آخرت کے کاموں میں کافی ہو جائے اور ہمیں اپنے مغفرت کیے ہوئے گنہگار بندوں میں شامل فرمالے (آمین ثم آمین)

وَ آخِرُ دَعْوانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْن

﴿ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾

(المائدہ: ۲۷)

قبولیتِ اعمال

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

اقتباس

یہاں ایک نکتے کی بات سن لیجیے۔ اگر بات ہوتی قابلیت کی، تو ہمارے لیے خطرہ زیادہ تھا۔ ہم پھنس جاتے۔ اس لیے کہ قابلیت تو ہے نہیں۔ بات قابلیت کی نہیں ہے، بات قبولیت کی ہے، جہاں اس بات کو سن کر نیکیوں والے خوش ہوئے ہیں، وہاں خاطی اور پاپی بھی مایوس نہ ہوں، بات قبولیت کی ہے، جس کو مالک چاہے قبول کر لے۔ چنانچہ اگر ہم مانگنا شروع کر دیں تو کیا پتہ کہ اس کی رحمت کی نظر ہم مسکینوں پر بھی پڑ جائے۔ اس لیے امید ہمارے لیے بھی ہے۔ دروازے بند نہیں ہیں۔ بس! اللہ سے محبت کا اظہار کیجیے۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

قبولیتِ اعمال

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (المائدہ:۲۷)
وَ قَالَ تَعَالٰى فِيْ مَقَامٍ اٰخَر
﴿وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت:٦٩)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّتِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (المائدہ:۲۷)

''بے شک اللہ تعالیٰ متقیوں ہی کے اعمال کو قبول فرماتے ہیں۔''

لفظ قبول کی صرفی ولغوی تحقیق:

لسان العرب میں ہے:

اَلْقُبُوْلُ مِنْ قَبْلِ الشَّيْءِ

''قبول یہ ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز کو پسند کر لے۔''

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا﴾ (الاحقاف:١٦)

التقبل باب تفعل سے ہے۔

چیز پسند آنے کی عمومی وجہ:

انسان کو جب بھی کوئی چیز اچھی لگے اور پسند آئے تو اس کو حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ عام طور پر پسند آنے کی وجہ صفات ہوتی ہیں۔ جب کوئی چیز صفات والی ہو تو وہ اچھی لگتی ہے۔ صورت اچھی ہو یا سیرت اچھی ہو۔ مثال کے طور پر:

......اچھا منظر کہیں بھی ہوگا تو انسان کو اچھا لگے گا۔

......اچھا مکان بنا ہوا ہو یا اچھی مسجد بنی ہوئی ہو، تو انسان کا دل اس کی طرف کھنچے گا۔

......اچھا لباس بھی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

......اچھی شخصیت والا انسان ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔

صفات میں کمی کے باوجود چیز پسند آ جانا:

اگر صورت اور سیرت دونوں اچھی ہوں تو نورٌ علی نور، لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے، کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صفات میں کمی کے باوجود چیز اچھی لگتی ہے۔ مثلاً

⊙......بعض کھلاڑی اپنے کھیل کے اندر دنیا میں نمایاں مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ لوگ ان کے دیوانے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ان کی شکلیں دیکھنے کے قابل بھی نہیں ہوتی، لیکن لوگ ان کے نمبر کی شرٹیں پہن کے پھر رہے ہوتے ہیں۔

⊙......قرآن عظیم الشان سے بھی اس کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن کے ایک واقعہ کی وجہ سے گفتگو میں ذرا دشواری ہوتی تھی (انگارہ منہ میں رکھ لیا تھا) اسی لیے دعا مانگی تھی:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَ یَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ

لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ﴾ (طٰهٰ:۲۸)

تو قرآن مجید سے ثبوت مل رہا ہے کہ ان کے بولنے میں دشواری تھی۔ کجی ہوتی تھی۔ ان کے دل میں بات آئی کہ ہارون علیہ السلام بڑے فصیح اللسان ہیں۔ تو قرآن گواہی دے رہا ہے:

﴿هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانِیْ﴾ (القصص:۳۴)

اب دیکھیے کہ فصیح اللسان ہارون علیہ السلام ہیں لیکن اللہ نے اپنے ساتھ ہمکلامی کے لیے کن کو پسند کیا؟ موسیٰ علیہ السلام کو پسند فرمایا: یہ پسند کرنے والے پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿کَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا﴾ (النساء:۱۶۴)

⊙ ...... کشمیر کے سفر میں بعض ایسے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں کہ انسان کا جی چاہتا ہے کہ کھڑا ہو کر دیکھتا ہی رہے۔ وہاں تصوراتی خوبصورتی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وادی نیلم، وادی کاغان، وادی ناران، وادی لیپا، ...... اللہ اکبر! ...... قدرتی خوب صورتی اور حسن کی وہ عجیب جگہ ہے۔

لیکن یہ خوب صورت پہاڑ اپنی جگہ کھڑے رہ گئے اور اللہ تعالیٰ نے ہمکلامی کے لیے کس پہاڑ کو پسند کیا؟ جبل طور کو پسند کیا، جس کے اوپر دیکھنے کو درخت بھی نظر نہیں آتا۔

اپنے حبیب ﷺ کے لیے جبل احد کو پسند کیا۔ اس کے اوپر بھی کہیں درخت نظر نہیں آتا۔ اور اللہ کے حبیب ﷺ نے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا:

((اُحُدٌ جَبَلٌ یُحِبُّنَا وَ نُحِبُّهٗ))

''احد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔''

سبحان اللہ! اللہ کے حبیب ﷺ جس پہاڑ سے محبت کرتے ہیں وہ احد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کے قریب جن پہاڑوں کو پسند کیا ان پر کوئی سبزہ ہی نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ﴾ (ابراہیم: ۳۷)

تو سرسبز پہاڑ کھڑے رہ گئے اور اللہ کو جو پہاڑ پسند آ گئے ان پر سبزے کا نام و نشان ہی نہیں۔

◎ ...... ماں باپ کے گھر بیٹی پیدا ہوئی۔ دیکھنے میں اتنی کالی کہ رات کی طرح اور پھر انہوں نے اس کا نام بھی رکھا تو کیا؟ لیلیٰ۔ ''رات کی طرح کالی''۔ لیکن مجنوں صاحب کو پسند آ گئی۔ وہ اس پر مرا جاتا تھا۔

کہتے ہیں: حاکم وقت نے سوچا کہ یہ مجنوں کس کے پیچھے اتنا دیوانہ ہوا پھرتا ہے، ذرا میں دیکھوں تو سہی کہ وہ کون سی حور پری ہے۔ چنانچہ اس نے لیلیٰ کو بلوایا۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ وہ حاکم وقت اس کو دیکھ کر کہنے لگا:

از دگر خوباں تو افزوں نیستی

''لیلیٰ! تو دوسری حسیناؤں سے کوئی زیادہ اچھی اور بہتر تو نہیں ہے''

لیلیٰ نے جواب میں کہا:

گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی

''جناب! خاموش رہیے، اس لیے کہ آپ کے پاس دیکھنے کے لیے مجنوں کی آنکھ نہیں ہے۔''

◎ ...... سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس وقت کے امرا تھے۔ بہت ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ گھرانوں کے افراد اس کے اردگرد موجود تھے، مگر اسے ایک ایسا نوجوان پسند آیا جس کا نام ''ایاز'' تھا۔ وہ دیہات کا رہنے والا تھا اور اتنا لکھا پڑھا ہوا بھی نہیں تھا، مگر محمود کی نظر میں بھا گیا۔

◉ ......ہم نے اپنی زندگی میں دیکھا کہ بہت ہی پڑھی لکھی اور اچھے مالدار گھرانوں کی لڑکیوں کو طلاق ہو جاتی ہے اور غریب گھر کی ان پڑھ لڑکیوں پر ان کے خاوند اس طرح فدا ہوتے ہیں کہ وہ مزے کی زندگی گزارتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ عمومی طور پر تو صفات کی وجہ سے چیز پسند آتی ہے مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ بغیر خوبی کے ہی کوئی پسند آ جائے۔

کیا ہمارے اعمال قبولیت کے لائق ہیں؟

اب یہاں ذہن میں ایک بات آتی ہے کہ ہم جتنے بھی اعمال کر رہے ہیں، کیا ہمارے یہ اعمال قبولیت کے لائق بھی ہیں؟

ابن عطا اسکندری رحمۃ اللہ علیہ اسکندریہ (مصر) میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک صاحب دل انسان تھے۔ انہوں جامعۃ الازہر میں پڑھانا شروع کیا......الازہر یونیورسٹی کو جو پوری دنیا میں شہرت ملی، وہ انہی اساتذہ کی وجہ سے ملی......ان کی حکمت بھری باتوں پر مستقل ایک کتاب ہے۔ وہ ان میں ایک بات فرماتے ہیں:

رُبَمَا فُتِحَ لَكَ بَابُ الطَّاعَةِ وَ مَا فُتِحَ لَكَ بَابُ الْقُبُوْلِ

"کئی مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تمہارے اوپر عمل کا دروازہ تو کھول دیا جائے لیکن قبولیت کے دروازے کو نہ کھولا جائے۔"

تو انسان اعمال کرتا رہتا ہے لیکن قبولیت نہیں ہوتی۔ اس کی مثالیں بھی سن لیجیے۔

◉ ......شیطان ابلیس نے مردود ہونے سے پہلے اتنی عبادت کی کہ زمین کا کوئی چپہ ایسا نہیں جس پر اس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ ہزاروں سال عبادت کی، لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ﴾ (الزمر: ۷۷)

''میرے دربار سے نکل جا، تو مردود ہے۔''

انجام برا ہوا۔ ہزاروں سال کی عبادت کو ٹھوکر مار دی۔

⊙...... بنی اسرائیل میں بلعم باعور بڑا عبادت گزار تھا۔ اس نے تین سو سال تک عبادت کی حتیٰ کہ مستجاب الدعوات بندے کے درجے تک پہنچ گیا۔ وہ جو بھی دعا کرتا تھا وہ قبول ہوتی تھی لیکن بالآخر اس نے ایسی غلطی کی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ﴾

(الاعراف:۱۷۶)

اور پھر آگے جو الفاظ ہیں، وہ پڑھتے ہوئے دل کانپتا ہے۔ فرمایا:

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ﴾ (الاعراف:۱۷۶)

جب یہ الفاظ پڑھتا ہوں تو فوراً یہ بات ذہن میں آتی ہے:

''اللہ! اس بندے نے تین سو سال تو سجدے کیے تھے نا، ہماری تو زندگی بھی تین سو سال کی نہیں ہے۔''

تو تین سو سال کی عبادت کے باوجود پھٹکار دیا گیا، اللہ فرماتے ہیں:

''اس کی مثال کتے کی مانند ہے''۔ اللہ اکبر کبیراً

اس لیے بزرگوں نے کہا:

لَا عِبْرَةَ بِالطَّاعَةِ اِذَا لَمْ يَصْحَبْهَا قَبُوْل

''اس اطاعت کا کوئی اعتبار نہیں جو قبولیت کے رتبے کو نہ پہنچے۔''

یہ بھی فرمایا:

لَيْسَ كُلُّ طَاعَةٍ سَبِيْلًا مَثُوْبَةِ اللّٰهِ وَ رِضْوَانِهٖ

''ہر طاعت اور نیکی اللہ رب العزت کی رضا کے درجے تک نہیں پہنچ پاتی۔''

اس لیے فکر مند ہونا چاہیے کہ ہمارے اعمال اللہ رب العزت کے ہاں قبول ہو جائیں۔دل میں اس بات کا خوف رہے کہ کہیں یہ رد نہ کر دیے جائیں۔اللہ کے حضور یہ فریاد کی جائے:

اے کریم آقا! ہر چہ گیرو علتی علت شود

اعمال تو ہمارے ناقص ہیں۔ہم بھی ناقص، ہمارے عمل بھی ناقص۔آپ قبول فرمالیجیے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:

ہمارے بزرگوں نے ایک عجیب بات کہی ہے۔فرماتے ہیں:

لَوْلَا جَمِيْلُ سَتْرِهٖ لَمْ يَكُنْ عَمَلًا اَهْلًا لِلْقَبُوْلِ

''اگر اللہ رب العزت کی ستاری نہ ہوتی تو بندے کا کوئی عمل قبولیت کے لائق ہی نہ ہوتا۔''

امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک عجیب تحقیق کی ہے۔وہ اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

''انسان جتنا بھی اچھے طریقے سے عبادت کر لے، جتنا زور لگا لے، جتنی کوشش کر لے، اس کی عبادت اللہ کی شان کے پردوں سے نیچے رہ جاتی ہے۔اللہ اس سے بھی بلند ہیں۔''

چنانچہ ہم اپنی پوری زندگی میں کبھی اس کے شایان شان عبادت نہیں کر سکتے۔

عبادت کرنے کا حق:

سید الاولین والآخرین امام الدنیا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کتنی خشوع والی ہوتی تھی۔آپ کی عمر مبارک کی بھی اللہ نے قسم کھائی۔آپ کی شان

قرآن مجید میں بیان فرمائی لیکن اس کے باوجود اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ وَ مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ))

''اے اللہ! جیسی تیری عبادت کا حق تھا ہم وہ حق ادا نہیں کر سکتے اور جیسے تیری معرفت حاصل کرنے کا حق تھا ہم وہ معرفت بھی حاصل نہیں کر سکے۔''

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ چالیس سال تک ان کا معمول رہا تہجد پڑھنے کا۔ عشا کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتے تھے۔ ..... اللہ اکبر کبیرا..... پھر حرم کی زیارت کے لیے گئے۔ طواف کیا۔ مقام ابراہیم پر دو نفل ادا کیے۔ پھر دو نفل ادا کرنے کے بعد یہ دعا مانگی:

((مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ))

''اے اللہ! جیسے تیری عبادت کا حق تھا ہم وہ حق ادا نہیں کر سکے۔''

ہم لوگ کس کھیت کی مولی ہیں، ہماری کیا اوقات ہے۔ چنانچہ ہم ایسی عبادت ہرگز نہیں کر سکتے جو اللہ رب العزت کی شان کے مطابق ہو۔ بس میں ہی نہیں۔ اس کی شان اس سے بھی بلند، اس سے بھی بلند، اس سے بھی زیادہ بلند ہے۔ وہ مالک بہت بڑا ہے۔ سوچوں سے بھی بڑا ہے۔ جہاں سوچ کی انتہا ہوتی ہے پروردگار کی شان اس سے بھی بلند ہے۔

شایانِ شان عبادت نہ کرنے پر اجر کیسے؟

یہاں ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی شان اتنی بلند ہے کہ ہم اس کی شایانِ شان عبادت کر ہی نہیں سکتے تو پھر عبادت پر اجر کیسے ملے گا؟

علما نے اس کا جواب دیا ہے۔ اس کی مثال آپ یوں سمجھیں کہ آپ اپنے بیٹے کو پہلے دن اسکول چھوڑ کے آئے۔ وہ دوپہر کو واپس آیا۔ کہتا ہے: ابو میں نے گنتی لکھنی سیکھی ہے۔ باپ کہتا ہے: پھر تختی دکھاؤ۔ وہ تختی دکھاتا ہے۔ اس پر جا بجا سیاہی کے

دھبے لگے ہوئے ہیں۔ ٹیڑھی میڑھی لکیریں لگی ہوئی ہیں۔ اور جو لکھا ہوا ہے اس کی سمجھ بھی نہیں آتی، مگر آپ بچے کی حوصلہ افزائی کے لیے جیب سے پیسے نکال کر اس کو آئس کریم لے کر دیتے ہیں۔ اب یہ آئس کریم اس کی خوش خطی کا انعام نہیں ہے، بلکہ یہ آپ کی محبت کا اظہار ہے۔

ہمیں جو عبادتوں پر اجر ملتا ہے وہ ہماری عبادت کی اچھائی کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''بے شک اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے، رحیم ہے''

وہ دیکھتا ہے کہ یہ کوشش تو کرتے پھرتے ہیں۔ چنانچہ جیسے بھی عمل ہوتے ہیں وہ قبول فرما لیتے ہیں۔

نجات کا دارومدار رحمتِ الٰہی پر ہے:

پھر یہاں پر بھی طالب علم کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کئی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اعمال کے بدلے جنت ملے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (الزخرف:۸۳)

''یہ جنت ہے، اس کا وارث ہم نے اسے بنایا جو تم میں سے اچھے اعمال کرے۔''

ایک جگہ اور بھی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾

''جنت میں داخل ہو جاؤ، اس لیے کہ تم اچھے اعمال کرتے تھے۔''

اور اگر حدیث مبارکہ پر غور کریں تو حدیث مبارکہ میں ہے:

((لَنْ يَّدْخُلَ اَحَدٌ الْجَنَّةَ بِعَمَلِهٖ))

”تم میں سے کوئی بھی بندہ اپنے عملوں کی وجہ سے جنت میں نہیں جائے گا۔“
بخاری شریف کی ایک روایت میں بھی ہے۔ جابرؓ راوی ہیں۔ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((لَا يُدْخِلُ اَحَدًا مِّنكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ وَلَا يُجِيرُهُ مِنَ النَّارِ وَلَا اَنَا اِلَّا بِرَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى))

”تم میں سے کسی کو بھی اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا نہ اسے جہنم سے چھڑائے گا اور نہ ہی میں سوائے اللہ کی رحمت کے“

بخاری شریف کی دوسری روایت میں ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((لَنْ يُّنْجِىَ اَحَدًا مِنكُمْ عَمَلُهُ))

”تم میں سے کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دلائے گا“

((قَالُوا: وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ))

”صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ بھی؟

((قَالَ: وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ يَتَغَمَّدَنِىَ اللّٰهُ بِغُفْرَانِهِ))

”نبی علیہ السلام نے فرمایا: ہاں! میں بھی، البتہ اگر اللہ کی مغفرت ڈھانپ لے تو اور بات ہے۔“

ایک اور حدیث مبارکہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت سے مخاطب ہو کر فرمایا:

((اَنْتَ رَحْمَتِى اَرْحَمُ بِكَ مَنْ اَشَاءُ مِنْ عِبَادِى))

”تو میری رحمت ہے، میں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہوں گا، تمہارے ذریعے سے اس پر رحم فرماؤں گا۔“

اب علما نے یہاں اس کی تفصیل لکھی ہے کہ بندہ اپنے عملوں کی وجہ سے جنت میں جائے گا یا نہیں جائے گا۔

حافظ ابنِ رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اِنَّ عَمَلَ الْاِنْسَانِ لَا یُنْجِیْهِ مِنَ النَّارِ وَ لَا یُدْخِلُهُ الْجَنَّةَ، اِنَّ ذٰلِكَ كُلَّهٗ اِنَّمَا یَحْصِلُ بِمَغْفِرَةِ اللّٰهِ وَ رَحْمَتِهٖ

''بے شک بندے کا عمل نہ جہنم سے نجات دلا سکتا ہے اور نہ جنت میں داخل کروا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی رحمت سے ہونا ممکن ہے۔''

علامہ ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:

علامہ ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تحقیق کی۔

⊙......وہ فرماتے ہیں:

اِنَّ تَوْفِیْقَ الْعَمَلِ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ لَوْلَا رَحْمَةُ اللّٰهِ السَّابِقَةُ مَا حَصَلَ الْاِیْمَانُ وَ لَا الطَّاعَةُ الَّتِیْ یَحْصِلُ بِهَا النَّجَاةَ

''عمل کی توفیق اللہ کی رحمت سے ہوتی ہے۔ اگر اللہ کی رحمت نہ ہوتو نہ تو بندہ ایمان قبول کر سکتا ہے اور نہ ہی ایسی عبادت کر سکتا ہے جس سے نجات مل سکے۔''

لہٰذا اگر عملوں پر بھی بندے کو جنت مل جائے تو عمل تو اللہ کی رحمت سے ہو رہا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رحمت سے ہی بندہ جنت میں جائے گا۔

⊙......دوسری بات فرماتے ہیں:

اِنَّ مَنَافِعَ الْعَبْدِ لِسَیِّدِهٖ فَعَمَلُهٗ مُسْتَحَقٌّ لِمَوْلَاهُ فَمَهْمَا اَنْعَمَ عَلَیْهِ مِنَ الْجَزَاءِ فَهُوَ مِنْ فَضْلِهٖ

''غلام کا نفع آقا کا نفع ہوتا ہے (کیونکہ وہ اس کا مملوک ہوتا ہے۔ اور مملوک کا ہر فائدہ اس کے مالک کا ہوتا ہے) اس کا ہر کام اس کے آقا کا ہوتا ہے۔ جو

بھی مالک اس کے کام کرنے پر کوئی انعام دے دے تو یہ اس کی اجرت نہیں ہوتی، وہ مالک کا احسان ہوتا ہے۔''

بھئی! ہم تو اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کی ملک ہیں۔ اگر ہم عمل کریں بھی سہی تو چونکہ اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں لہٰذا یہ عمل اللہ کے ہوں گے، لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ ان اعمال کی بنیاد پر جنت بھی دے دیتے ہیں تو یہ جنت ہمارا حق نہیں ہے۔ بلکہ یہ اللہ کا فضل ہے۔

⊙......پھر ایک تیسری دلیل دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اِنَّ اَعْمَالَ الطَّاعَاتِ کَانَتْ فِیْ زَمَنٍ یَسِیْرٍ وَ الثَّوَابَ لَا یَنْفَدُ فَالْاِنْعَامُ الَّذِیْ لَا یَنْفَدُ فِیْ جَزَاءِ مَا یَنْفَدُ بِالْفَضْلِ لَا بِمُقَابَلَۃِ الْاَعْمَالِ

محدود وقت میں ہمارے محدود اعمال ہیں لیکن ان پر اگر جنت ملے گی تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوگی۔ اب محدود عملوں پر لامحدود اجر، یہ عملوں کے بدلے میں تو نہیں ہو سکتا، یہ تو اللہ کی رحمت سے ہی ہو سکتا ہے نا۔

ایک مرفوع حدیث سے تائید:

اس مضمون کی وضاحت ایک حدیث پاک سے بھی ہوتی ہے جس کو حاکم نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ یہ مرفوع حدیث جبرائیل علیہ السلام سے مروی ہے۔ انہوں نے نبی علیہ السلام کو بتایا:

((اِنَّ عَابِدًا عَبَدَ اللّٰہَ عَلٰی رَأْسِ الْجَبَلِ فِی الْبَحْرِ خَمْسَ مِأَۃَ سَنَۃً ثُمَّ سَأَلَ رَبَّہٗ اَنْ یَقْبِضَہٗ سَاجِدًا، قَالَ جِبْرِیلُ فَنَحْنُ نَمُرُّ عَلَیْہِ اِذَا ھَبَطْنَا وَ اِذْ عَرَجْنَا۔ وَ نَجِدُ فِی الْعِلْمِ اَنَّہٗ یُبْعَثُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فَیُوْقَفُ بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ فَیَقُوْلُ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ: اُدْخُلُوْا عَبْدِیْ الْجَنَّۃَ بِرَحْمَتِیْ، فَیَقُوْلُ الْعَبْدُ: یَا رَبِّ بِعَمَلِیْ یُفْعَلُ ذٰلِكَ ثَلَاثَ

مَرَّاتٍ ثُمَّ يَقُوْلُ اللّٰهُ الْمَلَائِكَةَ تَائِيسُوا عَبْدِيْ بِنَعْمَتِيْ عَلَيْهِ وَ بِعَمَلِهِ...... فَيَجِدُوْنَ نِعْمَةَ الْبَصَرِ قَدْ اَحَاطَتْ بِعِبَادَةِ خَمْسَ مِأَةَ سَنَة......وَبَقِيَتْ نِعْمَةُ الْجَسَدِ لَهٗ فَيَقُوْلُ اُدْخُلُوا عَبْدِيَ النَّارِ فَيُجَرُّ اِلَى النَّارِ فَيُنَادِيْ بِرَحْمَتِكَ اَدْخِلْنِيَ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِكَ اَدْخِلْنِي الْجَنَّةَ۔فَيُدْخِلُهُ الْجَنَّةَ قَالَ جِبْرِيْلَ :اِنَّمَا الْاَ شْيَاءَ بِرَحْمَةِ اللّٰهِ يَا مُحَمَّد صلی اللہ علیہ وسلم!)

''ایک عبادت گزار بندے نے ایک پہاڑ کی چوٹی کے اوپر پانچ سو سال تک عبادت کی ۔ پھر اس نے دعا مانگی : اے اللہ! مجھے سجدے میں موت عطا فرما دینا۔ (یہ دعا قبول ہوگئی اور اسے مرنے کے بعد دفن کر دیا گیا)۔ جبرئیل علیہ السلام نے بتایا: جب ہم آسمان پر جاتے اور نیچے آتے تو اس کے قریب سے ہم گزرتے ہیں ۔ ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ اس بندے کو قیامت کے دن کھڑا کیا جائے گا اور اس کو اللہ رب العزت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے اس بندے کو میری رحمت سے جنت میں داخل کر دو۔ وہ بندہ کہے گا: یا اللہ! میرے عملوں کی وجہ سے۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوگا۔ (اللہ فرمائیں گے کہ اسے میری رحمت سے جنت میں داخل کردو اور وہ کہے گا: میرے عملوں کی وجہ سے۔ جب وہ تین مرتبہ ایسا کہے گا تو) پھر اللہ تعالیٰ ملائکہ کو حکم فرمائیں گے: میرے بندے کے عملوں اور اس پر جو میری نعمتیں تھیں ان کا ذرا حساب چیک کرلو۔ جب چیک کریں گے تو آنکھوں کی بینائی کی نعمت کی قیمت پانچ سو سال کی عبادت پڑ جائے گی۔ جسم کی باقی ساری نعمتیں اس کے علاوہ ہوں گی ۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے : میرے بندے کو جہنم میں داخل کر دو۔ فرشتے اس کو جہنم کی طرف گھسیٹنے لگیں گے۔ وہ چیخے گا، چلائے

گا، کہے گا: اللہ! تو اپنی رحمت سے مجھے جنت میں داخل کر دے، تو اپنی رحمت سے مجھے جنت میں داخل کر دے۔ پھر اسے جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: اے محمد ﷺ! معاملہ تو اللہ رب العزت کی رحمت کے اوپر موقوف ہے۔''

ماں نے کون سا بیٹا جنا ہے جو یہ کہے کہ میں نعمتوں کا حساب دینے کے قابل ہوں۔ ہم تو بھئی! اللہ کی نعمتوں کا حساب نہیں دے سکتے۔ تو جب ہم حساب ہی دینے کے قابل نہیں، ناپ تول کے ہی قابل نہیں ہیں تو اگر جنت ملے گی تو وہ اللہ کی رحمت سے ہی ملے گی۔

روایات میں تطبیق:

محترم سامعین! اگر اللہ تعالیٰ ہمارے عملوں کو پکڑنے پہ آ جائے تو یقیناً بہت مشکل بن جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (فاطر:۴۵)

''اور اگر اللہ پکڑنے پہ آ جائے جو تم عمل کرتے ہو، تو زمین کی پیٹھ پر کوئی جاندار باقی نہیں بچے گا۔''

یہی مضمون حدیث پاک میں بھی بیان فرمایا گیا، چنانچہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((لَوْ اَنَّ اللّٰهَ عَذَّبَ اَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَ اَرْضِهٖ لَعَذَّبَهُمْ وَ هُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَّهُمْ وَ لَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهٗ خَيْرًا لَّهُمْ))

اب تطبیق کیسے ہوگی؟

علما نے اس کا جواب دیتے ہوئے حدیثِ مبارکہ پیش کی، نبی علیہ السلام نے

ارشاد فرمایا:

((دُخُوْلُ الْجَنَّةَ بِفَضْلِهٖ وَ دَرَجَاتِهٖ بِحَسْبِ الْاَعْمَالِ))

''جنت میں داخلہ اللہ کے فضل سے ہوگا اور جنت کے اندر بندوں کے درجے عملوں کے حساب سے ہوں گے۔''

قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ (الاحقاف:۱۹)

جب بندہ جنت میں داخل ہو جائے گا تو اس کے عملوں کے مطابق اس کی الاٹمنٹ کر دی جائے گی۔

قبولیتِ اعمال کی علامات

دل میں ایک بات آتی ہے کہ جب معاملہ قبولیت پر ہے تو ہمیں کیسے پتہ چلے کہ ہمارے عمل اللہ کے ہاں قبول بھی ہیں یا نہیں؟

علما نے اعمال کی قبولیت کی کچھ علامات لکھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کے اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں شرف قبولیت پا لیتے ہیں۔

(۱) عمل شرع وسنت کے مطابق ہو:

سب سے پہلی علامت:

مُوَافَقَةُ الْعَمَلِ لِمَاجَاءَ بِهِ الشَّرْعُ وَصَحَّتْ بِهِ السُّنَّةُ

''انسان جو بھی عمل کرے، وہ شریعت اور سنت کے مطابق ہو۔''

اس کو کہتے ہیں:

مِيْزَانُ الْاَعْمَالِ فِیْ ظَاهِرِهَا

''ظاہر میں تولنے کی ایک کسوٹی''۔

مثال کے طور پر ایک دن اعمال کرنے کی بڑی کیفیت بنی ہوئی ہے اور صوفی صاحب کہتے ہیں: جی! میں تو آج فجر کی چار رکعت پڑھوں گا، اگر وہ اس طرح کرے گا تو اللہ کے ہاں مردود ہوں گی۔ پڑھا قرآن ہے، پڑھی نماز ہے، کیے سجدے ہیں، مگر لات ماردیں گے اس کو۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کا یہ عمل شریعت وسنت کے مطابق نہیں ہے۔ تو کوئی بھی عمل جو ظاہر میں سنت کے مطابق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قبول نہیں فرمائیں گے۔ اس لیے کہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ اَحْدَثَ فِي اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ))

''جو ہمارے اس دین کے اندر نئی چیز (بدعات) پیدا کرے، اس کو رد کر دیا جائے گا۔''

اس لیے عمل ہمیشہ شریعت اور سنت کے مطابق ہونا چاہیے۔

ہمارے مشائخ فرماتے ہیں:

''ہمارے سالک کا سلوک اتباع سنت کے ذریعے سے طے ہوتا ہے۔''

امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سنت کے اتباع کے بارے میں فرماتے ہیں:

''دوپہر کے وقت سنت قیلولہ کی نیت سے تھوڑی دیر سو جانے پر وہ اجر ملتا ہے جو ہزاروں سال کی نفلی شب بیداریوں پر نہیں مل سکتا۔''

سبحان اللہ! ان حضرات کے دل میں سنت کی کیا ہی قدر ومنزلت تھی۔ دیکھیں! ادھر شب بیداری ہے اور ادھر نیند ہے، مگر اس نیند کو چونکہ نبی علیہ السلام کی نیند کے ساتھ ایک نسبت حاصل ہو جاتی ہے اس لیے ہزاروں نفلی شب بیداریوں سے زیادہ مقام پالیتی ہے۔

ہمارے اکابر میں سے مولانا یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ فرمایا کرتے تھے:

''سنت طریقے پر پیشاب پاخانہ کر لینے پر وہ اجر ملتا ہے جو خلافِ سنت طریقے

پر نفلیں پڑھنے پر بھی نہیں مل سکتا۔“

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سنت کے اتنے پابند تھے کہ ایک مرتبہ آپ کے دانت میں درد تھا۔ آپ نے ایک سالک سے فرمایا: بھئی! لونگ لے کر آؤ۔ اس زمانے میں لونگ چبا لینے سے درد میں کمی ہو جاتی تھی۔ وہ لونگ لے آیا اور دے دیے۔ جب ان پر حضرت کی نظر پڑی اور گنے تو وہ طاق عدد نہیں تھے۔ حضرت نے فرمایا: صوفی بنے پھرتے ہیں اور ان کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ

((اَللّٰهُ وِتْرٌ وَ يُحِبُّ الْوِتْرَ))

”اللہ تعالیٰ خود بھی اکیلا ہے اور طاق عدد کو پسند فرماتے ہیں“

فرمایا: جب یہ بات حدیث میں آ گئی ہے تو پھر تم نے اس کی رعایت کیوں نہ کی؟ اب بتائیں یہ لونگ لے کر آنا کتنا چھوٹا سا عمل نظر آتا ہے۔ لیکن اس میں بھی سنت کی اتباع کا اتنا اہتمام فرماتے تھے۔ اللہ اکبر کبیرا

ایک کتاب میں تو عجیب بات پڑھی۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

”جو میرے بس میں سنتیں تھیں، میں نے ان پر عمل کر لیا، ایک سنت کو پورا کرنے کی تمنا تھی۔ وہ کیا؟ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ چھوٹے تھے۔ ان کو نبی علیہ السلام نے اٹھایا ہوا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حسین رضی اللہ عنہ نے پیشاب کر دیا۔ اس سے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے گیلے ہو گئے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ اللہ نے بیٹی تو دی ہے مگر نواسہ نہیں ہے، بڑی تمنا تھی کہ میں بھی اسے اٹھاتا اور میرے بھی کپڑے گیلے ہوتے۔ مگر نواسہ نہ ہوا۔ چنانچہ نصیحت فرمائی: اگر میرے مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ میری بیٹی کو بیٹا عطا کرے تو اس بچے کو میری قبر پر بٹھا دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ وہاں پر پیشاب کر دے۔“

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سواری پر سوار ہیں۔ فاصلہ طے ہو رہا ہے۔ سواری کھڑی کر کے نیچے اترتے ہیں۔ ایک درخت کے نیچے جا کر بیٹھتے ہیں۔ پھر اٹھ کر آتے ہیں اور

سفر شروع کر دیتے ہیں ۔ پوچھنے والے نے کہا: حضرت! جب قضائے حاجت کی ضرورت نہیں تھی تو پھر رکے کیوں؟ وقت کیوں لگایا؟ جواب میں فرمایا: میں نے اپنے آقا ﷺ کو دیکھا۔ محبوب ﷺ نے یہاں سواری روکی تھی اور یہاں بیٹھ کر فارغ ہوئے تھے۔ اگرچہ مجھے حاجت درپیش نہیں تھی لیکن میرا جی چاہا کہ میں وہی کروں جو میرے آقا ﷺ نے کیا۔

یہ سنت سے محبت، ذرا حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھیے۔ جنہوں نے اہلِ فارس سے کہا تھا:

أَ أَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيْبِي لِهٰؤُلَاءِ الْحُمَقَاءِ

ان احمقوں اور روشن خیالوں کی وجہ سے میں اپنے محبوب ﷺ کی سنت کو ترک کر دوں۔

تو قبولیت کی پہلی علامت یہ ہے کہ ظاہر میں وہ عمل سنت کے مطابق ہو۔ کھانا بھی حلال کھائے اور عمل بھی طیب کرے، اس لیے کہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا))

اس لیے جو انسان رزقِ حلال کا اہتمام کرتا ہے۔ اللہ رب العزت اس کے اعمال کو قبول فرما لیتے ہیں۔ نبی علیہ السلام نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو نصیحت فرمائی:

((يَا سَعْدُ! أَطِبْ مَطْعَمَكَ تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَةِ))

”اے سعد! اپنے کھانے کو حلال کر لے، اللہ تعالیٰ تجھے مستجاب الدعوات بنا دیں گے۔“

آج کل صوفیوں کا پیٹ ٹریشن کین (کچرے کا ڈبہ) بنا ہوا ہے۔ جو بھی گند بلا ہو اسی میں ڈالتے ہیں۔ صوفی کا پیٹ کوئی تیلی کا کولہو تو نہیں ہے نا۔ اس لیے کہ کولہو میں جو چیز ڈالو وہ پیتا ہے۔ اور صوفی کا پیٹ بھی، اس میں جو ڈالو، وہ پیس دیتا

ہے۔حرام حلال کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔بس!لذت حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہے۔جی!مجھے PIZZA کھانے کا شوق ہے۔اور پھر بھاگتے ہیں شہر کی طرف...... میکڈونلڈ کی طرف...... کے ایف سی کی طرف...... یہ باہر سے آئی ہوئی کمپنیاں کیا ڈالتی ہیں؟ اللہ جانے۔حلال پیسے خرچ کر کے حرام کھاتے ہیں۔ہم تو اس کے بارے میں نہیں جانتے۔اللہ جانے کیا ہے؟ تحقیق کس کو ہے؟ ذکر وسلوک سیکھنا ہے تو حلال کا اہتمام کریں۔

(۲)عمل سے مقصود اللہ کی رضا ہو:

قبولیت اعمال کی دوسری علامت:

اِبْتِغَاءُ وَجْهِ اللّٰهِ بِالْعَمَلِ

''عمل سے مقصود اللہ کی رضا ہو''

اس کو کہتے ہیں: مِيْزَانُ الْاَعْمَالِ فِي بَاطِنِهَا ''باطن میں تولنے کی کسوٹی''۔ یہ دیکھنا کہ عمل اللہ کے لیے ہے یا نہیں۔چنانچہ طبرانی شریف کی روایت ہے۔

نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ اِلَّا مَا كَانَ خَالِصًا وَابْتُغِيَ بِهٖ وَجْهُهٗ))

اس لیے ہم جب بھی عمل کریں تو اللہ کی رضا کے لیے کریں۔اسی لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف کی ابتدا انما الاعمال بالنیات سے کی ہے کہ عملوں کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔

مطرف بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

صَلَاحُ الْقَلْبِ بِصَلَاحِ الْعَمَلِ وَصَلَاحُ الْعَمَلِ بِصَلَاحِ النِّيَّةِ

''قلب کی درستی،عمل کی درستی سے ہوتی ہے اور عمل کی درستی،نیت کی درستی سے ہوتی ہے۔''

(۳) اعمال واحوال میں ترقی محسوس ہو:

اعمال کی قبولیت کی تیسری علامت:

زِيَادَةُ الْاَعْمَالِ وَالتَّرَقِّیْ فِی الْاَحْوَالِ

جب بندے کا عمل اللہ کے ہاں قبول ہوتا ہے تو اس کو پھر اللہ تعالیٰ وجد، لذت، شوق اور ذوق عطا فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ احمد بن عجیبہ اپنی کتاب ''اِیْقَاظُ الْهِمَمْ'' میں فرماتے ہیں:

مَنْ وَجَدَ ثَمْرَةَ عَمَلِهٖ عَاجِلًا فَهُوَ دَلِيْلٌ عَلٰی وَجُوْدِ الْقُبُوْلِ اٰجِلًا

''عمل کرتے ہوئے جس بندے کو لذت محسوس ہو جاتی ہے، یہ دلیل ہے کہ بعد میں اللہ نے اس کو قبول بھی کر لینا ہے۔''

مختلف اعمال کو قبول کرنے کی علامتیں مختلف ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

⊙...... فَمِنْ عَلَائِمِ قُبُوْلِ اللّٰهِ لِلصَّلٰوةِ اَنْ يَشْعَرَ الْمُصَلِّیْ فِيْهَا بِلَذَّةِ الْاِقْبَالِ عَلَی اللّٰهِ

''نماز کی قبولیت کی علامت یہ ہے کہ نماز پڑھنے والے کو واقعی محسوس ہو کہ میں اللہ کے سامنے کھڑا ہوں۔''

بسا اوقات نماز میں بندے کی ایسی کیفیت بنتی ہے کہ اور محسوس ہوتا ہے کہ میں اللہ کے سامنے کھڑا ہوں۔

⊙...... فَمِنْ عَلَائِمِ قُبُوْلِ اللّٰهِ الْمَنَاسِكِ الْحَجِّ اَنْ تَقْطَعَهُ عَنْ مَشَاغِلِ الدُّنْيَا وَ هُمُوْمِهَا

''حج کے مناسک کی قبولیت کی علامت یہ ہے کہ جو بندہ حج پر جاتا ہے تو وہاں جا کر دل دنیا کے مشاغل اور فکروں سے کٹ جاتا ہے۔''

اور اگر پیچھے دل اٹکا رہے، ایک طواف کیا کعبے کا اور دس طواف کیے بازار

کے، تو صحیح معنوں میں فائدہ نہیں ہوگا۔ حاجی کو اس بات کا پتہ نہیں ہوتا کہ حرم میں کس کس جگہ پر دعائیں قبول ہوتی ہیں، البتہ گھڑیوں کی قیمت کا پتہ ہوتا ہے کہ کس گھڑی کی کیا قیمت ہے۔ دکانوں کے چکر ہی لگاتے رہتے ہیں۔

⊙...... فَمِنْ عَلَائِمِ قُبُوْلِ اللّٰهِ لِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ اَنْ يَّشْعَرَ اَنَّهٗ مَاثِلٌ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ

"تلاوت قرآن کی قبولیت کی علامت یہ ہے کہ تلاوت کرنے والے کی کیفیت ایسی ہو جیسے میں اپنے پروردگار سے ہمکلام ہو رہا ہوں۔"

(۴) اعمال میں ہمیشگی ہو:

قبولیت اعمال کی چوتھی نشانی:

اَلْمُدَاوَمَةُ عَلَى الْعَمَلِ

"عمل پر ہمیشگی اختیار کرنا"

یعنی جو عمل اللہ کے ہاں قبول ہونا ہوتا ہے اللہ اس کے اوپر پھر استقامت کے ساتھ چلنے کی توفیق دے دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں: اللہ اس عمل کو آنے والوں میں جاری فرما دیتے ہیں۔

ہمارے بزرگوں نے اس بات کو شارٹ کٹ کر کے یوں بیان کیا:

"اے دوست! تیرا ایک نماز پڑھنے کے بعد دوسری نماز کے لیے مسجد میں آ جانا تیری پہلی نماز کی قبولیت کی دلیل ہے۔"

قبول کی ہے تو آنے دیا ہے نا۔ ناراض ہوتے تو آنے ہی نہ دیتے۔ آپ خود دیکھیں کہ بندہ جس سے ناراض ہوتا ہے اس کو اپنے گھر میں آنے سے روک دیتا ہے۔ باپ، بیٹے کو گھر میں آنے سے روک دیتا ہے۔ بھائی، بھائی کو روک دیتا ہے۔ خاوند، بیوی کو روک دیتا ہے۔ اگر اللہ ناراض ہوتے تو اپنے گھر آنے سے روک

دیتے۔ اگر آنے دیا ہے تو یہ کس کی دلیل ہے؟ کہ ارادہ خیر کا ہے۔ اللہ تعالیٰ عطا کرنا چاہتے ہیں۔ دینا چاہتے ہیں۔ اب تو جھولی پھیلانے والے پر منحصر ہے کہ وہ کتنا مانگتا ہے۔

(۵) تقویٰ:

پانچویں چیز جس کی وجہ سے اعمال قبول ہوتے ہیں، وہ ''تقویٰ'' ہے۔ انسان جتنا متقی ہوگا اتنے اس کے عمل اللہ کے ہاں شرف قبولیت پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (المائدہ:۲۷)

اس کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں:

⊙...... امام العلما والصلحا حضرت خواجہ محمد عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کا تقویٰ حیران کن تھا۔ حضرت سردی گرمی میں ہاتھ میں چھتری رکھتے تھے۔ علما حیران ہوتے تھے کہ گرمیوں میں تو چھتری ہاتھ میں رکھنے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے لیکن سردی کے موسم میں چھتری کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک عالم نے پوچھ لیا: حضرت! سخت سردی میں بھی آپ ہاتھ میں چھتری رکھتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ تو حضرت نے فرمایا: چونکہ آپ عالم ہیں اس لیے آپ کا ذہن صاف کرنا ضروری ہے۔ مجھے اس کی نہ تو گرمیوں میں ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی سردیوں میں، میں اس کو ہاتھ میں اس لیے رکھتا ہوں کہ راستہ چلتے ہوئے اگر دائیں طرف سے عورتیں آرہی ہوتی ہیں تو میں چھتری اس طرف کر لیتا ہوں۔ اور بائیں طرف سے آرہی ہوں تو ادھر کر لیتا ہوں۔ حتیٰ کہ میں عورتوں کے کپڑے بھی نہیں دیکھتا۔ پھر فرمایا: لوگوں کی نظر میں چھتری کا سایہ ہے اور میری نظر میں غیر محرم سے نظر کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ اللہ اکبر کبیراً

جب غیر محرم سے نظر کی اتنی حفاظت کی جائے تو پھر اللہ تعالیٰ بندے کو کیا ...

ہیں؟ حدیث پاک میں آتا ہے:

''اللہ ایسے بندے کو حلاوتِ ایمان عطا فرما دیتے ہیں۔''

حضرت کی عادتِ شریفہ تھی کہ نماز کی جماعت خود کرواتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ تکبیر ہو جاتی تھی اور تھوڑے توقف کے بعد آپ تکبیرِ تحریمہ کہتے تھے۔ جیسے پندرہ بیس سیکنڈ یا آدھا منٹ۔ حضرت کی جماعت میں اکثر علما ہوتے تھے۔ مردان میں ایک عالم نے پوچھا: حضرت! آپ تکبیر ہو جانے کے فوراً بعد نیت نہیں باندھتے اور تھوڑا سا توقف ہو جاتا ہے، کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟ حضرت نے جواب دیا:

''مولانا! آپ تو عالم لوگ ہیں، آپ کی تو کیفیتیں بنی رہتی ہیں، میں فقیر آدمی ہوں، مصلے پر کھڑا ہوتا ہوں، جب تک مجھے سامنے بیت اللہ نظر نہیں آتا، میں تحریمہ نہیں باندھتا۔''

ادھر غیر محرم سے نظر کی حفاظت کی اور ادھر اللہ نے ایسی نماز عطا فرما دی۔ مقام احسان والی نماز! جتنا زیادہ تقویٰ ہوگا اتنی زیادہ قبولیت ہوگی۔

⊙...... امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب پوری دنیا میں مشہور ہے۔ کیوں؟ ان کے تقویٰ کی وجہ سے۔

⊙...... ہمارے اکابر علمائے دیوبند کی محنت اللہ کے ہاں اتنی مقبول ہوئی کہ آج دارالعلوم دیوبند کو پوری دنیا کے اندر شہرت حاصل ہے۔ کیوں؟ ان کے تقویٰ کی وجہ سے۔

(۶) دعا:

قبولیت کی چھٹی علامت ''دعا'' ہے۔ رونے سے اور مانگنے سے قبولیت مل جاتی ہے۔ اس کی دلیل قرآن عظیم الشان میں ہے۔

دیکھیں! عمران علیہ السلام کی اہلیہ امید سے ہیں اور اس حالت میں وہ اللہ سے ایک

دعا مانگتی ہیں:

﴿رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ﴾

(الاحقاف:۱۹)

''اے اللہ! میرے اس بچے کو، جو ہونے والا ہے، قبول کر لیجیے۔''

اب ماں تڑپ کے دعا مانگ رہی ہے۔ یہ تڑپ تڑپ کے مانگنا اللہ کے ہاں اس قدر پسندیدہ ہے کہ رب کریم فرماتے ہیں:

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ (آلِ عمران:۳۷)

قبول کر لیا نا، اللہ نے۔

ہم اگر اوپر کی سب علامات کو دیکھیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ سوائے دعا کے ہمارے پلے اور کچھ نہیں ہے۔ بس! ہم دعا مانگیں: اللہ! آپ رحمت کر دیجیے اور آپ ہمارے ان ٹوٹے پھوٹے عملوں کو قبول فرما لیجیے۔

انبیائے کرام کو قبولیت اعمال کی فکر:

انبیائے کرم کو بھی یہ خوف لاحق ہوتا تھا۔

ابتهال الانبياء الى الله بان يرزقهم القبول

انبیا کو بھی یہ خوف دامن گیر رہتا تھا۔ سنیے:

⊙ ......ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ﴾

(البقرۃ:۱۲۷)

''اور یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیم اور ان کے بیٹے اسماعیل نے میرے گھر کی بنیادوں کو بلند کیا۔''

اس وقت انہوں نے کیا کہا؟

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ (البقرۃ:۱۲۷)

''اے ہمارے پروردگار! ہم سے یہ قبول فرمالے۔''

دیکھیں! قبولیت علم کی کتنی فکر دامن گیر تھی۔ دعا مانگتے ہیں:

﴿رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَا﴾

(ابراھیم:۴۰)

''اے پروردگار مجھے اور میری اولاد کو نمازی بنا اور ہماری دعا قبول فرما''

دیکھا! قبولیت کی ہے نا فکر۔

⊙......خود نبی ﷺ نے امت کو یہی تعلیم دی کہ ہم قبولیت پر ہی نظر رکھیں۔ چنانچہ کتنی ایسی دعائیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے پیارے حبیب ﷺ نے قبولیت مانگنے کی تعلیم دی ہے۔ مثال کے طور پر:

⊙......حدیث پاک میں ہے کہ جب نبی ﷺ جانور ذبح فرمانے لگتے تو پڑھتے:

((اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَمِنْ اُمَّۃِ مُحَمَّدٍ ﷺ))

⊙......ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے دعا مانگی:

((رَبِّ اَعِنِّیْ وَ تَقَبَّلْ تَوْبَتِیْ وَ اَجِبْ دَعْوَتِیْ))

⊙......ایک روایت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی علیہ السلام نے دعا مانگی:

((اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ حَسَنَاتِیْ))

''اے اللہ! میرے نیک عملوں کو قبول فرما''

⊙......ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی علیہ السلام افطار کے وقت دعا مانگتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ))

⊙......ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی علیہ السلام نے دعا مانگی:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَ رِزْقًا طَیِّبًا وَ عَمَلًا مُّتَقَبَّلًا))

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں عدمِ قبولیت کا خوف:

اب یہ جتنا کچھ ہم نے سنا اس کی ذرا پریکٹیکل شکل صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں دیکھیں، یہ وہ جماعت تھی جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے چنا، جو اپنے استاد کے کمالات کا آئینہ تھے۔ کہتے ہیں کہ اگر استاد کے کمالات کو دیکھنا ہو تو اس کے شاگردوں کو دیکھو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کو دیکھنا ہو تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کو دیکھ لو۔

علما نے لکھا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی۔ اور نبی علیہ السلام سے پوچھا گیا: انبیا کی تعداد کتنی ہے؟ تو نبی علیہ السلام نے بتایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ جتنے انبیا تھے اتنے ہی صحابہ۔ علما نے اس بات میں ایک راز لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کے ہر صحابی رضی اللہ عنہ کو کسی نہ کسی نبی کے، جو نبوت کے علوم اور برکات تھیں، ان کا وارث بنا دیا۔ اسی لیے نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((اَلصَّحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ))

''میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، تم جس کسی کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔''

ان صحابہ میں وہ ہستیاں بھی تھیں جو عشرہ مبشرہ میں سے تھیں۔ ان کا نام لے کر نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ جنت میں جائیں گے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جن کے بارے میں قرآن مجید میں آچکا ہے:

﴿رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ﴾ (البینۃ:۸)

اس سب کے باوجود ان کے دل پر یہ خوف طاری رہتا تھا کہ پتہ نہیں موت کے وقت ہمارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ اب سنیے...... مَخَاوِفُ الصَّحَابَۃِ مِنْ عَدْمِ قُبُوْلِ الْاَعْمَالِ...... امید ہے کہ آپ توجہ کے ساتھ سنیں گے۔ اس میں ہمارے

لیے بہت حکمت کی باتیں ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ:

خلفائے راشدین میں سے سب سے پہلے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ وہ صحابی ہیں جن کے بارے میں نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِنْ اُمَّتِيْ خَلِيْلًا لَا تَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ خَلِيْلًا))

(مشکوۃ المصابیح: ۵۵۴)

''اگر اپنی امت میں سے میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو میں ابوبکر کو اپنا خلیل بناتا۔''

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اَهْلَ الجنة ليراؤون اهل عليين كَمَا تَرَوْنَ الْكَوْكَبَ الدُّرِّيَّ فِي اُفُقِ السَّمَاءِ وَ اِنَّ اَبَا بَكْرٍ وَّ عُمَرَ مِنْهُمْ وَ اَنْعَمَا))

(مشکوۃ المصابیح: ۵۵۹)

''جنت میں جنتی جائیں گے تو نیچے والے اوپر والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے زمین والے ستاروں کو دیکھتے ہیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ ان میں سے اس سے بھی اونچے ہیں۔''

ان کو علما نے ہم خانۂ رسول کہا ہے۔ ہم خانۂ رسول کا کیا مطلب؟ کہ جنت میں جو درجہ نبی علیہ السلام کو ملے گا، اسی درجے میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی پہنچایا جائے گا۔ کیسے؟ جیسے آپ ڈبل سٹوری منزل دیکھتے ہیں، اسی طرح جنت کی اوپر کی منزل میں اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم قیام فرمائیں گے اور اسی محل کی نیچے کی منزل میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ قیام فرمائیں گے۔

نبی علیہ السلام نے فرمایا:

''میرے بدن مبارک کو بنایا گیا، کچھ مٹی بچ گئی تھی، اس بچی ہوئی مٹی سے اللہ نے ابوبکر کے بدن کو بنایا، پھر جو مٹی بچی تو عمرؓ کا بدن بنا دیا گیا۔''

ایک ہی مٹی تھی، پھر دیکھو! اللہ نے ایک ہی جگہ پر پہنچا دیا۔ مٹی اکھٹی ہوگئی۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

''میں نے سب کے احسانات کا بدلہ دے دیا، ابوبکر! تیرے احسانات کا بدلہ قیامت کے دن اللہ دے گا۔''

نبی علیہ السلام پر اتنے احسان تو کیے تھے۔ ایسے صحابی!!!

نبی علیہ السلام نے جب تبوک کے مقام پر فرمایا کہ اللہ کے راستے میں لاؤ تو عمرؓ کہتے ہیں میرے پاس وسعت تھی، میں سے سوچا کہ آج ابوبکر سے میں بڑھ جاؤں گا، چنانچہ میں نے آدھا مال گھر کے لیے چھوڑا اور آدھا مال آگے لے کر گیا۔ اللہ کے حبیب ﷺ کے حضور پیش کیا۔ پوچھا: عمر! کیا لائے ہو؟ عرض کیا: اے اللہ کے محبوب ﷺ! آدھا پیچھے چھوڑ آیا ہوں اور آدھا لا کر آپ کی خدمت پیش ہوا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ اتنے میں وہ فقیر (حضرت ابو بکر صدیقؓ) بھی آ گیا، وہ عاشق رسول بھی آ گیا۔ نبی علیہ السلام نے پوچھا:

((مَا اَبْقَيْتَ لِاَهْلِكَ))

''ابوبکر! گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ کے آئے؟''

جواب میں عرض کیا:

اَبْقَيْتُ لَهُمُ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (مشکوۃ المصابیح: ۵۵۴)

''میں ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو چھوڑ کے آیا ہوں''

اللہ اکبر! سارے گھر کا سامان، حتی کہ لباس اتار کر ٹاٹ کا لباس پہن لیا اور اپنا لباس بھی اس سامان میں شامل کر دیا۔ پھر یہیں تک بس نہیں، بلکہ دیوار پر ہاتھ مارا کہ

کہیں کوئی سوئی بھی اٹکی ہوئی نہ ہو میں وہ سوئی بھی اس سامان میں شامل کر دوں۔

جب نبی علیہ السلام کی خدمت میں یہ سامان پیش کیا تو نبی علیہ السلام حیران ہیں کہ سب کچھ دے دیا۔ اس وقت جبرئیل علیہ السلام اترتے ہیں۔ سلام عرض کیا اور کہا:

''اے اللہ کے پیارے حبیب ﷺ! اللہ رب العزت نے ابو بکر کی طرف سلام بھیجے ہیں۔''

نبی علیہ السلام نے دیکھا کہ جبرئیل علیہ السلام نے ٹاٹ کا لباس پہنا ہوا ہے۔ شیخ الحدیث کہتے ہیں: نبی علیہ السلام نے پوچھا: جبرئیل! آج یہ ٹاٹ کا لباس کیسا؟ عرض کیا:

''اے اللہ کے پیارے حبیب ﷺ! اللہ رب العزت ابو بکر کے اس عمل سے اتنا خوش ہیں کہ آسمان کے فرشتوں کو حکم دیا کہ آج تم بھی ابو بکر جیسا لباس پہنو۔''

پھر اس کے بعد کہا:

''اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: جاؤ! ابو بکر سے پوچھو، کیا اس حال میں تم مجھ سے راضی ہو؟''

یہ سن کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگے:

''میں اپنے اللہ سے ہر حال میں راضی ہوں۔''

اب ذرا یہ بات دیکھیں کہ وہ صحابی جن کو عرشوں سے سلام آیا کرتے تھے، ان کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے:

⊙...... جب وہ کسی پرندے کو دیکھتے تو فرماتے:

طُوْبٰی لَکَ یَا طَیْرُ مَا اَنْعَمَکَ عَلٰی ھٰذِہِ الشَّجَرَۃِ تَاکُلُ مِنْ ھٰذِہِ الثَّمَرَۃِ ثُمَّ تَمُوْتُ ثُمَّ لَا تَکُوْنُ شَیْئًا لَیْتَنِیْ مَکَانَکَ یَالَیْتَ اَبَا بَکْرٍ

مِّثْلُكَ

''اے پرندے! تجھے مبارک ہو، تو اس درخت کے اوپر کتنا اچھا بیٹھا ہوا ہے۔ تو درختوں کے پھل کھائے گا اور پھر فوت ہو جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ تجھے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے۔ کاش! میں تیری جگہ پر ہوتا۔ کاش! ابوبکر تیری مانند ہوتا (کہ اسے بھی تیری طرح حساب نہ دینا پڑتا)۔''

⊙......ایک مرتبہ فرمایا:

لَيْتَنِيْ شَجَرَةٌ تَعْضُدُ ثُمَّ تُوْكَلُ

''کاش میں درخت کی طرح ہوتا۔ پھر اس کو کھالیا جاتا''

⊙......ایک مرتبہ فرمایا:

لَيْتَنِيْ خَضِرَةٌ تَاكُلُنِيْ الدَّوَاتُ

''کاش! میں گھاس ہوتا جس کو چرندے چر لیتے۔''

یہ باتیں کرنے کا مقصد کیا تھا؟ اللہ رب العزت کے سامنے پیش ہونے کا اتنا ڈر تھا۔ اتنا خوف غالب تھا۔ کہتے تھے کہ اللہ رب العزت کے سامنے پیش ہونا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

«وَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا لَقِيَكَ الشَّيْطَانُ سَالِكًا فَجًّا قَطُّ اِلَّا سَلَكَ فَجًّا غَيْرَ فَجِّكَ» (مشکوۃ المصابیح: ۵۵۷)

اللہ اکبر! قسم کھا کر فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اے عمر! تم جس راستے سے گزرتے ہو، شیطان اس راستے کو چھوڑ دیتا ہے۔''

نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((لَقَدْ كَانَ فِيمَا قَبْلَكُمْ مِنَ الْأُمَمْ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ يَّكُ فِيْ اُمَّتِيْ اَحَدٌ فَاِنَّهٗ عُمَرٌ)) (مشکوۃ المصابیح:۵۵۶)

''جو پہلی امتیں گزری ہیں ان میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کو الہام ہوا کرتا تھا۔ اگر میری امت میں سے کوئی ایک ہوتا تو وہ عمر ہوتا۔''

اللہ اکبر!

یہی وہ عمر رضی اللہ عنہ تھے:

اَلَّذِيْ كَانَ رَايُهٗ مُوَافِقًا لِّلْوَحْيِ وَالْكِتَابِ

''کتنی مرتبہ اس کی رائے قرآن مجید کے حکم کے عین مطابق ہوتی تھی۔''

جن کو یہ شان ملی وہ فرماتے تھے:

⊙ ......وَ اللّٰهُ لَوْ اَنَّ لِيْ طَلَاعَ الْاَرْضِ ذَهَبًا لَافْتَدَيْتُ بِهٖ عَذَابَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ قَبْلَ اَنْ اَرَاهُ

''کاش! پوری زمین کے برابر اگر سونا میرے پاس ہوتا اور میں اللہ کے سامنے پیش ہونے سے پہلے فدیہ کے طور پر اس کو دے سکتا تو میں اسے دے دیتا۔''

⊙ ......کبھی فرماتے:

وَيْلِيْ وَيْلٌ لِاُمِّيْ اِنْ لَّمْ يَرْحَمْنِيْ رَبِّيْ

''ہلاکت ہے میری، ہلاکت ہے میری ماں کی، اگر اللہ نے قیامت کے دن میرے اوپر رحم نہ کیا۔''

⊙ ......ایک مرتبہ جانوروں کے بھوسے پر نظر پڑی اور فرماتے لگے:

يَالَيْتَنِيْ مِثْلَ هٰذِهِ التِّبْنِةِ

''کاش! میں اس بھوسے کی مانند ہوتا۔''

لَيْتَ اُمِّيْ لَمْ تَلِدْنِيْ

کاش! میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا۔''

لَيْتَنِيْ لَمْ اَكُ شَيْئًا

''کاش! میں کچھ بھی نہ ہوتا۔''

لَيْتَنِيْ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا

''کاش! میں کوئی بھولی بسری چیز ہوتا۔''

⊙......ایک مرتبہ نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ جب وہ قرآن مجید کی اس آیت پر پہنچے:

﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ﴾ (الصّٰفّٰت:۲۴)

تو انہوں نے رونا شروع کر دیا۔ حتیٰ کے رونے کی آواز جماعت کی آخری صف تک پہنچی۔ پھر اس غم کی وجہ سے ایک مہینہ بیمار رہے۔ اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ:

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی علیہ السلام نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا:

((يَا عَائِشَةُ اَلَا اَسْتَحْيِ مِنْ رَّجُلٍ تَسْتَحْيِ مِنْهُ الْمَلٰئِكَةُ))
(مشکوۃ المصابیح:۵۶۱)

''اے عائشہ! کیا میں ایسے بندے سے حیا نہ کروں جس سے ملائکہ بھی حیا کرتے ہیں؟''

پھر ایک مرتبہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ عُثْمَانَ رَضِيْتُ عَنْهُ فَارْضِ عَنْهُ))

''اے اللہ! میں عثمان سے راضی ہوں، اللہ! تو بھی اس سے راضی ہو جا۔''

وہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ جن کے بارے میں لسانِ نبوت سے اتنی عظمت بتائی گئی، وہ فرمایا کرتے تھے:

لَوْ وَقَفْتُ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ فَخُيِّرْتُ بَيْنَ اَنْ اَصِيْرَ رَمَادًا اَوْ اُخَيَّرَ اِلٰى اَيِّ الدَّارَيْنِ اَصِيْرُ، لَاخْتَرْتُ اَنْ اَكُوْنَ رَمَادًا

''اگر مجھے قیامت کے دن کھڑا کر کے پوچھا گیا کہ تیرا حساب لیں اور جنت دوزخ بھیجیں یا تجھے ہم مٹی بنا دیں، تو میں اللہ کے حضور اپنی پسند بتا دوں گا، اللہ! میرا حساب نہ لے، مجھے مٹی بنا دے۔''

یہ وہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں جن سے فرشتے بھی حیا کرتے تھے، جن کے بارے میں نبی علیہ السلام نے اپنے مبارک ہاتھ کو فرمایا: یہ عثمان کا ہاتھ ہے، اور یہ میرا ہاتھ ہے۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ:

سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ دمشق کے قاضی تھے اور سید القراء تھے۔ ایک مرتبہ ان کو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دوست ہونے کے ناطے نصیحت کی کہ تم اپنے جسم کا خیال رکھا کرو۔ تو نبی علیہ السلام نے تصدیق فرمائی:

((يَا اَبَا الدَّرْدَاءِ اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا مِثْلَ مَا قَالَ لَكَ سَلْمَانُ))

''اے ابودرداء! جیسے سلمان نے تجھے کہا ہے اسی طرح تمہارے جسم کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔''

وہ فرماتے تھے:

''لَوْلَا ثَلَاثٌ مَا اَحْبَبْتُ الْبَقَاءَ سَاعَةً ظَمَاُ الْهَوَاجِرِ وَالسُّجُوْدُ فِي اللَّيْلِ وَ مَجَالِسَةُ اَقْوَامٍ يَنْتَقُوْنَ جَيِّدَ الْكَلَامِ كَمَا يَنْتَقِي اَطَايِبَ

الثَّمَرِ"

"اگر تین چیزیں نہ ہوتیں تو مجھے زندگی سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ گرمیوں میں دوپہر کے وقت روزے کی وجہ سے پیاسا رہنا، رات کو سجدے کرنا اور اللہ والوں کی مجالس میں جانا، جیسے تم اچھے اچھے پھلوں کو چن لیتے ہو، ایسے ہی لوگ ان کی باتوں کو چن لیا کرتے ہیں۔"

نبی علیہ السلام نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اَبَا الدَّرْدَاء مِنَ الْعُلَمَاءِ الْفُقَهَاءِ الَّذِيْنَ يَشْفُوْنَ مِنَ الدَّاءِ))

"وہ لوگ جن کے پاس بیٹھنے سے روحانی بیماریوں کو شفا ملتی ہے، ابودرداان علما فقہا میں سے ہیں۔"

وہ فرمایا کرتے تھے:

"لَئِنْ اَسْتَيْقِنُ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ تَقَبَّلَ لِيْ صَلَاةً وَّاحِدَةً اَحَبَّ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا وَ مَا فِيْهَا"

"اگر مجھے اس بات کا پتہ چل جائے کہ اللہ نے میری ایک نماز کو قبول کر لیا ہے تو یہ مجھے دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے سب سے زیادہ پسندیدہ بات ہوگی۔"

ان حضرات کے اوپر اللہ تعالیٰ کے خوف کا ایسا غلبہ تھا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ:

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ قبیلہ بنو غفار کے تھے۔ یہ قبیلہ مکہ مکرمہ میں لوٹ مار میں بڑا مشہور تھا۔ جو بھی تجارتی قافلہ گزرتا، بنو غفار کے لوگ جا کر اس کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اس قبیلے میں سے جب ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مرتبہ دیا کہ ایک مرتبہ اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ کر فرمایا:

"ابوذر! تیرے جیسے سچے آدمی آج آسمان کے نیچے بہت تھوڑے ہیں۔"

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی تَوَاضُعِ عِیْسٰی بِن مَرْیَمَ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی اَبِیْ ذَرٍّ))

''تم میں سے اگر کوئی عیسیٰ علیہ السلام کی تواضع کو دیکھنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ ابوذر کو جا کر دیکھ لے۔''

ایک نبی کی تواضع!

اللہ اکبر! وہ ابوذر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''وَ اللّٰہِ لَوَدِدْتُ اَنَّ عَزَّوَجَلَّ خَلَقَنِیْ یَوْمَ خَلَقَنِیْ شَجَرَۃً تَعْضَدُ وَ یُوکَلُ ثَمَرُھَا''

''اللہ کی قسم! میں تمنا کرتا ہوں، کاش! جس دن اللہ نے مجھے پیدا کیا، وہ مجھے ایک درخت کی شکل میں پیدا کرتے اور اس درخت کو جانور کھا لیا کرتے۔''

ایسی باتیں کیوں کرتے تھے؟ اس لیے کہ وہ اللہ رب العزت کی عظمتوں کو جانتے تھے۔

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ:

ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ امیر جیش تھے۔ سبحان اللہ! دیکھیں، اللہ تعالیٰ بھی کیسے جوڑ ملاتا ہے۔

خلیفہ راشد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی نرم طبیعت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سپہ سالار خالد بن ولید جیسا دے دیا۔ دبنگ آدمی۔ اور پھر اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ دبنگ آدمی آ گئے تو اللہ نے ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ جیسا نرم طبیعت کا سپہ سالار عطا فرما دیا۔

نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((اِنَّ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَمِیْنًا وَ اَمِیْنُ هٰذِهِ الْاُمَّۃِ اَبُوْ عُبَیْدَۃَ بْنُ الْجَرَّاحِ))

''ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اور میری امت کا امین ابوعبیدہ بن جراح ہے۔''

جب ایک حدیث پاک پڑھتا ہوں تو جھومنے کو جی چاہتا ہے۔......آہاہا، سبحان اللہ! سبحان اللہ!......اللہ کے پیارے حبیب ﷺ نے کیا عجیب پیاری بات کہی۔ فرمایا:

((مَا مِنْکُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا لَوْ شِئْتُ لَاَخَذْتُ عَلَیْهِ بَعْضَ خُلُقِهٖ اِلَّا اَبَا عُبَیْدَۃَ))

''تم میں سے صرف ابوعبیدہ ایسا ہے کہ اس کے بعض اخلاق ایسے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میرے اندر بھی ہوں۔''

اللہ اکبر کبیرا!

وہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''وَدِدْتُ اِنِّیْ کُنْتُ کَبْشًا فَیَذْبَحُنِیْ اَهْلِیْ فَیَاْکُلُوْنَ لَحْمِیْ''

''کاش! میں ایک مینڈھا ہوتا، میرے گھر والے مجھے ذبح کر دیتے اور میرا گوشت کھا لیتے۔''

قیامت کے دن کا معاملہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہمارے اسلاف قیامت کے دن کے تصور سے رو پڑتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ:

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سید المحدثین تھے، سید الحفاظ تھے۔ ایک مرتبہ رو رہے تھے، کسی نے پوچھا: بھئی! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ فرمایا:

اَمَا اِنِّیْ لَا اَبْکِیْ عَلٰی دُنْیَا کُمْ هٰذِهٖ وَ لٰکِنْ اَبْکِیْ لِبُعْدِ سَفَرِیْ وَقِلَّۃِ

زَادِیْ اَصْبَحْتُ فِیْ صَعُوْدٍ مُهْبِطَةٍ عَلٰی جَنَّةٍ وَّ نَارٍ فَلَا اَدْرِیْ اِلٰی اَیِّهِمَا یُسْلَكُ بِیْ

''میں تمہاری اس دنیا پر نہیں روتا، بلکہ میں روتا ہوں کہ میرا سفر لمبا ہے اور میرا توشہ تھوڑا ہے۔ میں ایک گھاٹی کی طرف چڑھ رہا ہوں جو پہنچتی ہے جنت کی طرف یا جہنم کی طرف، اور میں نہیں جانتا کہ مجھے ان دونوں میں سے کس کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔''

جنت میں اتروں گا یا جہنم میں اتروں گا۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہے۔

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ:

حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو نبی علیہ السلام نے ''صاحب سر'' فرمایا: ایک مرتبہ بیٹھے رو رہے تھے، کسی نے پوچھا: حضرت! کیوں رو رہے ہیں؟ فرمایا:

مَا اَبْکِیْ اَسَفًا عَلَی الدُّنْیَا بَلِ الْمَوْتُ اَحَبُّ اِلَیَّ وَلٰکِنْ لَا اَدْرِیْ عَلٰی مَا اُقَدِّمُ عَلَی الرِّضَا اَمْ عَلٰی سَخَطٍ

''میں دنیا پر افسوس نہیں کر رہا، بلکہ موت مجھے بہت پسندیدہ ہے۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ جب میں اللہ کے سامنے پیش ہوں گا تو وہ مجھ سے راضی ہوں گے یا مجھ سے ناراض ہوں گے۔''

حضرت حسن رضی اللہ عنہ:

نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ، جن کے بارے میں نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّہٗ فَاَحِبَّہٗ))

''اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں، آپ بھی اس سے محبت فرمالیجیے۔''

ان کے بارے میں نبی علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا:

((اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ))

''حسن اور حسینؓ جنت کے جوانوں کے سردار ہیں''

وہ فرمایا کرتے تھے:

''اِنِّیْ اَقْدِمُ عَلٰی اَمْرٍ عَظِیْمٍ وَ ھَوْلٍ لَمْ اَقْدَمْ عَلٰی مِثْلِہٖ قَطُّ''

''میں ایک ایسے عظیم امر کی طرف جا رہا ہوں کہ ایسا عظیم معاملہ کبھی کسی کو پیش نہیں آئے گا۔''

حضرت سالم مولیٰ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ:

سالم، ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے غلام تھے، انہوں نے ان کو آزاد کر دیا، پھر بیٹا بنا لیا۔ اللہ کی شان دیکھیں! پردے کی آیتیں اتریں تو ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بیوی نبی علیہ السلام کے پاس آگئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے نبی! ہم نے اس کو بیٹے کی طرح گھر میں پالا ہے۔ اب پردے کی آیتیں اتر گئیں ہیں اور وہ ہمارا نا محرم بن گیا ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا: صرف تمہارے لیے کہہ رہا ہوں کہ تم سالم کو اپنا دودھ پلاؤ۔ وہ بالغ تھے لیکن آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے تخصیص فرما دی کہ اب بھی اگر سالم دودھ پی لے گا تو تمہارا بیٹا ہے، چنانچہ بیٹا بن گیا۔

وہ اللہ سے محبت کرنے والا نوجوان بنا۔ کیسی محبت تھی ان کے دل میں؟ سید العاشقین، اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں حدیث پاک میں فرمایا:

((یُحِبُّ اللّٰہُ عَزَّ وَ جَلَّ حَقًّا مِنْ قَلْبِہٖ))

''سالم، اپنے دل سے اللہ تعالیٰ سے سچی محبت کرتا ہے۔''

یہ الفاظ نبوت کی زبان سے نکل رہے ہیں...... اللہ اکبر کبیراً...... وہ کیسے نوجوان ہوں گے۔!!! لسانِ نبوت سے گواہی دلوائی جا رہی ہے کہ سالم وہ نوجوان ہے جو

اپنے دل سے اللہ تعالیٰ سے سچی محبت کرتا ہے۔

وہ سالم فرماتے تھے:

"وَدِدْتُ اِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ اَصْحَابِ الْاَعْرَافِ"

''میں تمنا کرتا ہوں کہ مجھے قیامت کے دن نہ جنت بھیجیں نہ جہنم بھیجیں، بلکہ اعراف میں یعنی برابر سرابر چھوڑ دیا جائے۔''

اللہ اکبر! جن کے پاس اتنی محبتیں تھیں، عبادتیں تھیں، اللہ کے حبیب ﷺ کی گواہیاں تھیں، وہ بھی اللہ رب العزت کے سامنے پیش ہونے سے اتنا ڈرتے تھے۔ اللہ رب العزت کے سامنے پیش ہونا کوئی مذاق ہے؟

کاش! ہمارے دل پر اگر غفلت کے پردے نہ ہوتے تو ہم اس تصور سے بھی کانپ اٹھتے کہ ہمیں اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ یہی وجہ سے ہمارے اکابر قرآن کی آیت پڑھتے تھے:

﴿یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (المطففین:٦)

یہ آیت پڑھتے ہی بے ہوش ہو کر گر جاتے تھے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا:

ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو نبی علیہ السلام نے بشارت دی تھی کہ جنت میں تم میری بیویوں میں شامل ہوگی۔

ان کے بارے میں علمائے امت نے فرمایا:

اَفْقَہُ نِسَاءِ الْاُمَّۃِ عَلَی الْاِطْلَاقِ

''پوری امت کی عورتوں میں ۔ سے سب سے زیادہ دین کی سمجھ رکھنے والی تھیں۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے آدھا دین نبی علیہ السلام سے سیکھا اور گھر کے متعلقہ دین انہوں

نے ام المومنین سے سیکھا۔

وہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جن کو اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پسند کیا۔ جبرئیل علیہ السلام ان کی تصویر لے کر آئے تھے کہ اے میرے محبوب! اللہ نے آپ کی شریکِ حیات کے طور پر ان کو پسند کیا ہے۔

وہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جن کی پاکدامنی پر اللہ کی طرف سے گواہیاں آئیں۔ یوسف علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، بہتان لگتا ہے، بچے سے گواہی دلوائی۔ بی بی مریم اللہ کی ولیہ ہیں، بہتان لگتا ہے، بچے کی زبان سے گواہی دلوائی۔ مگر اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی شریک حیات پر جب بہتان لگا تو رب کریم خود گواہی دیتے ہیں۔ دلوں کے بھید جاننے والی ذات فرماتی ہیں:

﴿سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ﴾ (النور:۱۶)

جن کی پاکدامنی کی گواہیاں قرآن دے رہا ہے۔ آج بھی تلاوت ہو رہی ہے نمازوں میں، تراویح میں، وہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جن کے بارے میں نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((يَا عَائِش! هٰذَا جِبْرِيْل يَقْرِءُ كِ السَّلَام))

یہاں یا عائشہ نہیں کہا گیا، یعنی پورا نام نہیں لیا گیا، بلکہ یا عائش فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کئی مرتبہ منادی میں ترخیم کر لی جاتی ہے۔ آخری حرف کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ محبت کا انداز ہوتا ہے۔ تو نبی علیہ السلام نے فرمایا:

''یا عائش! یہ جبرئیل ہیں اور پیغام لے کر آئے ہیں کہ آپ کی طرف اللہ نے سلام بھیجے ہیں۔''

وہی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جن کے بارے میں نبی علیہ السلام فرماتے ہیں:

((فَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ))

''دنیا کی عورتوں پر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے ثرید کو باقی سب کھانوں پر فضیلت حاصل ہے۔''

وہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں:

"فَوَ اللّٰہِ لَوَدِدْتُ اِنِّی کُنْتُ نَسْیًا مَنْسِیًّا"

''اللہ کی قسم! میں تمنا کرتی ہوں کہ کاش! میں کوئی بھولی بسری چیز ہوتی (اور ختم ہو چکی ہوتی)۔''

وہ یہ بھی فرمایا کرتی تھیں:

"یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ وَرْقَةً مِنْ ھٰذِہِ الشَّجَرَةِ"

''کاش! میں کسی درخت کا پتہ ہوتی۔''

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ:

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((رَحِمَ اللّٰہُ اِبْنَ رَوَاحَةَ اِنَّہُ یُحِبُّ الْمَجَالِسَ الَّتِیْ تَتَبَاھٰی بِھَا الْمَلٰئِکَةُ))

''اللہ ابن رواحہ پر رحم فرمائے، یہ ایسی مجالس میں بیٹھنا پسند کرتا ہے جن مجالس پر ملائکہ بھی فخر کرتے ہیں۔''

جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو وہ رونے لگ گئے۔ کسی نے کہا: عبداللہ! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ فرمانے لگے:

وَ اللّٰہُ مَابَکَیْتُ جَزَعًا مِنَ الْمَوْتِ وَ لٰکِنِیْ بَکَیْتُ مِنْ قَوْلِ اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ اِنْ مِنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا، وَلَمْ اَدْرِ اَنْجُوْا مِنْھَا اَمْ لَا

''میں موت کے خوف کی وجہ سے نہیں رو رہا، بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے رو رہا ہوں کہ وَ اِنْ مِنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا اور میں نہیں جانتا کہ

میں نجات پاؤں گا یا نہیں پاؤں گا۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((رَجُلٌ صَالِحٌ))

"عبداللہ صالح آدمی ہے۔"

ایک اور جگہ فرمایا:

((نِعْمَ الرَّجُلُ))

"عبداللہ کتنا پیارا بندہ ہے۔"

ان کے بارے میں ایسے تعریفی الفاظ اللہ کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے نکلے ہیں۔

ان کے بارے میں سعید ابن الحسیب تابعی فرماتے ہیں:

"لَوْ شَهِدْتُ لِاَحَدٍ اَنَّهٗ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ لَشَهِدْتُ لِابْنِ عُمَرَ"

"اگر میں کسی کے بارے میں گواہی دیتا کہ یہ جنتی ہے تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں گواہی دیتا کہ یہ جنتی ہے۔"

ان کے غلام نافع فرماتے ہیں:

"لَوْ نَظَرْتُ اِلٰی اِبْنِ عُمَرَ اِذَا اِتَّبَعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَقُلْتُ هٰذَا مَجْنُوْنٌ"

"اگر میں ابن عمر کو دیکھتا کہ وہ اس طرح دیوانہ وار نبی علیہ السلام کی اتباع کرتے تھے تو میں کہتا تھا کہ واقعی وہ مجنون ہیں۔"

وہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے۔

ایک مرتبہ تلاوت کرتے ہوئے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس آیت پر پہنچے:

﴿یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (المطففین:٦)

یہ سن کر انہوں نے رونا شروع کر دیا۔ حتی کہ غش کھا کر گر گئے۔ پھر اس کے بعد قرآن پاک کی تلاوت نہیں کر سکے۔

وہ فرمایا کرتے تھے:

لَوْ عَلِمْتُ اِنَّ اللّٰهَ تَقَبَّلَ مِنِّیْ سَجْدَةً وَّاحِدَةً اَوْ صَدَقَةَ دِرْهَمٍ لَمْ یَکُنْ غَائِبٌ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الْمَوْتِ

''اگر میں جان لیتا کہ اللہ نے میرا ایک سجدہ قبول کر لیا ہے، یا صدقہ کا ایک درہم قبول کر لیا ہے تو مجھے کوئی بھی غائب چیز موت سے زیادہ محبوت نہ ہوتی''

گویا دوسرے الفاظ میں یوں فرماتے تھے:

''اگر مجھے پتہ چل جائے کہ اللہ نے میرا سجدہ قبول کر لیا ہے تو میں کبھی بھی اپنا سر سجدے سے نہیں اٹھاؤں گا۔''

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ:

کئی صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث سن کر یاد کرتے تھے۔ لیکن عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جو سنتے بھی تھے اور لکھتے بھی تھے۔ ان کا ''صحیفہ صادقہ'' آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ کاتب حدیث تھے۔

وہ فرماتے تھے:

وَ اللّٰهِ لَوَدَدْتُ اَنِّی هٰذِهِ السَّارِیَةُ

''میں تمنا کرتا ہوں کہ میں ایک ستون کی مانند ہوتا۔''

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو فرشتے بھی سلام کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے:

یَا لَیْتَنِیْ رَمَادًا تَذْرِیْنِی الرِّیْحُ

''اے کاش! مجھے مٹی بنا دیا جاتا، جسے ہوا اڑا کے لے جاتی۔''

حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ:

عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

وَدِدْتُ اِنِّیْ کُنْتُ کَبْشًا لِاَ هْلِیْ فَذَبَحُوْنِیْ فَشَوُّوْنِیْ وَ اَکَلُوْا لَحَمِیْ

''کاش! میں اپنے گھر والوں کا ایک مینڈھا ہوتا، وہ مجھے ذبح کرتے، پھر مجھے بھونتے اور میرا گوشت کھا لیتے۔''

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ:

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((اَعْلَمُ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذٌ))

ان کو نبی علیہ السلام نے خود بنفس نفیس یمن کی طرف معلم بنا کر بھیجا۔ ان کو اپنی سواری پر بٹھایا۔ خود سواری پہ ساتھ چلے اور پھر راستے میں نبی علیہ السلام نے ان سے ایک بات کہی۔ یہ تو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا دل تھا جس نے اس بات کو برداشت کر لیا۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((یَا مُعَاذُ اِنَّکَ عَسٰی اَنْ لَا تَلْقَانِیْ بَعْدَ عَامِیْ هٰذَا))

''اے معاذ! ممکن ہے کہ اس سال کے بعد ہم ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔''

اور آگے فرمایا:

((وَ لَعَلَّکَ لَنْ تَمُرَّ بِمَسْجِدِیْ وَ قَبْرِیْ))

''تو آئے گا تو میری مسجد کو دیکھے گا اور میری قبر کو دیکھے گا۔''

اللہ اکبر! ایک عاشق رسول نے یہ الفاظ سنے ہوں گے تو ان کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ چنانچہ

فَبَکٰی مُعَاذٌ جَعْشًا بِفِرَاقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ

نبی علیہ السلام نے ان کو فرمایا:

((یَا مُعَاذُ! اِنِّیْ اُحِبُّكَ فِی اللّٰهِ))

''اے معاذ! میں اللہ کے لیے تجھ سے محبت کرتا ہوں۔''

یہ اللہ کے رسول فرما رہے ہیں۔ (ان الفاظ پر حضرت جی دامت برکاتہم آبدیدہ ہو گئے)

وہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ قَبْضَتَيْنِ فَجَعَلَ وَاحِدَةً فِی النَّارِ وَاحِدَةً فِی الْجَنَّةِ فَلَا اَدْرِیْ فِیْ اَیِّ الْقَبْضَتَیْنِ اَكُوْنُ۔

''اللہ تعالیٰ نے دو مٹھیاں بھریں، ایک کو جنت میں اور ایک کو جہنم میں ڈال دیا، مجھے نہیں پتہ کہ میں کس مٹھی میں ہوں گا۔''

مجھے نہیں پتہ کہ میں جنت میں جاؤں گا یا جہنم میں جاؤں گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ:

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فقیہ الامت کہا:

کَانَ مِنَ السَّابِقِیْنَ الْاَوَّلِیْنَ

جو چھٹے نمبر پر ایمان لانے والے ہیں۔

جن کی پتلی پنڈلیوں کو دیکھ کر صحابہ ہنسے تو نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَهُمَا اَثْقَلُ فِی الْمِیْزَانِ مِنْ اُحُدٍ))

''وہ ذات جس کے قبضے میں میری جان ہے، یہ دونوں پنڈلیاں میزان کے اندر اللہ کے نزدیک احد پہاڑ سے بھی زیادہ وزنی ہیں۔''

وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

لَوْ وَقَفْتُ بَیْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ فَقِیْلَ لِیْ اِخْتَرْ نُخَیِّرُكَ مِنْ اَیِّهِمَا تَكُوْنُ اَحَبُّ اِلَیْكَ اَوْتَكُوْنُ رَمَادًا لَاَحْبَبْتُ اَنْ اَكُوْنَ رَمَادًا

''اگر مجھے جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا کر دیا گیا اور مجھے اختیار دیا گیا کہ حساب دے کر جنت جاتے ہو یا مٹی بنا دیں تو کہوں گا: اللہ! حساب نہ لے، مجھے مٹی بنا دے۔''

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ :

فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لِاَنَّ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ تَقَبَّلَ مِنِّیْ مِثْقَالَ حَبَّةٍ، اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا لِاَنَّهٗ تَعَالٰی یَقُوْلُ: اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ

''اگر میں جان لوں کہ اللہ نے میرے عملوں میں سے ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل قبول کرلیا ہے تو یہ مجھے دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، اس سے زیادہ پسند ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: بے شک اللہ تعالیٰ متقیوں کے عملوں کو ہی قبول فرماتے ہیں۔''

اس وجہ سے ہمارے اکابر اعمال بھی کرتے تھے اور ڈرتے بھی تھے۔

پسندیدگی کی دعا:

اب رہ گئی ہماری بات۔ تو بھئی! کوشش کریں کہ ہمارے اندر بھی عدم قبولیت کا خوف پیدا ہو جائے اور ہم اپنا یہ معمول بنالیں کہ ہر نماز کے بعد دعا مانگیں:

''اے اللہ! مجھے ایسا بنا دیجیے کہ میں آپ کو پسند آ جاؤں۔''

یہ دعا تو مانگ سکتے ہیں نا۔ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پوچھیں گے بنے کیوں نہیں؟ تو اتنا تو کہہ سکیں گے، اللہ! ہم مانگتے تھے کہ تو ہمیں ایسا بنا دے۔ اللہ تعالیٰ سے

اخلاص کے ساتھ یہ دعا مانگیں، اللہ تعالیٰ ایسا بنا دیں گے۔

خاطی و پاپی مایوس نہ ہوں:

یہاں ایک نکتے کی بات سن لیجیے۔ اگر بات ہوتی قابلیت کی، تو ہمارے لیے خطرہ زیادہ تھا۔ ہم پھنس جاتے۔ اس لیے کہ قابلیت تو ہے نہیں۔ بات قابلیت کی نہیں ہے، بات قبولیت کی ہے، جہاں اس بات کو سن کر نیکیوں والے خوش ہوئے ہیں، وہاں خاطی اور پاپی بھی مایوس نہ ہوں، بات قبولیت کی ہے۔ جس کو مالک چاہے قبول کر لے۔ چنانچہ اگر ہم مانگنا شروع کر دیں تو کیا پتہ، کہ اس کی رحمت کی نظر ہم مسکینوں پر بھی پڑھ جائے۔ اس لیے امید ہمارے لیے بھی ہے۔ دروازے بند نہیں ہیں۔ بس! اللہ سے محبت کا اظہار کیجیے۔

تری اک نگاہ کی بات ہے......:

کہتے ہیں کہ ایک خاوند اپنی بیوی سے ناراض ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا: تو کیا نکمی سی میرے پلے پڑ گئی۔ نہ شکل ہے، نہ عقل ہے، نہ تعلیم ہے، نہ خاندان ہے، کیا ہے تیرے پاس؟ جب خاوند نے خوب سنائیں تو جواب میں بیوی نے کہا تھا:

نہیں کوئی اوقات اوگن ہار دی
جیہو جئی وی ہاں میں ہاں سرکار دی

''مجھ نکمی کی کوئی اوقات نہیں ہے، میں جیسی بھی ہوں، مگر ہوں تو آپ کی ہی''

اے اللہ! ہم بھی کسی کام کے نہیں ہیں، مگر کلمہ پڑھا ہے۔ اللہ! کافروں نے ہمیں اپنا دشمن بنایا اور ہم ان کے دشمن بنے۔ حتی کہ ایمان والے روشن خیالوں نے بھی ایمان والوں کو دشمن سمجھنا شروع کر دیا۔ دنیا سے الگ ہو گئے۔ ہمارے پاس تو کوئی اور در نہیں ہے۔ ''جیہو جئی وی ہاں میں ہاں سرکار دی''۔ اللہ! ہم جیسے بھی ہیں، ہیں تو

آپ کے بندے نا۔ آپ کے در پر آئے بیٹھے ہیں۔ آپ کے دین کی نسبت مل رہی ہے، علم کی نسبت مل رہی ہے،

......آپ کے دین کی نسبت مل رہی ہے،

......علم کی نسبت مل رہی ہے،

......قرآن وحدیث کی نسبت مل رہی ہے،

اے اللہ! اگر ہم برے ہیں، جو بھی ہیں، ہیں تو آپ کے۔ اے اللہ! اگر آپ نے بھی دھتکار دیا تو پھر ہمارے پاس تو کوئی دوسرا در نہیں۔ اللہ! آپ ہی رحمت فرما دیجیے۔ آپ ہم پر محبت کی ایک نظر ڈال دیجیے۔ اللہ! ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، ہمارے لیے کوئی دوسرا نہیں در نہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ جو آپ کے در سے خالی جاتا ہے، وہی بد بخت ہوا کرتا ہے۔ اے اللہ! ہمیں شقی نہ بنا دینا۔ اپنے در سے دھتکار نہ دینا۔ اے اللہ! اگر آپ عمل دیکھنے پہ آجائیں تو ہمارے پاس ندامت کے سوا کچھ نہیں۔ بس! ہمارے پاس فریاد ہے۔ اے اللہ! ہمارے پاس مناجات ہیں اور اتنی بات ہے کہ اللہ! ہم آپ کے ہیں۔ اے اللہ! آپ ہمیں قبول فرما لیجیے۔ ہم پر رحمت کی نظر ڈال دیجیے۔ اے اللہ! آپ کے یہ بندے دور قریب سے چل کر یہاں آئے۔ اے اللہ! آپ ان کا یہاں آنا قبول فرما لیجیے۔ یہ دل میں جو مرادیں لے کر آئے ان کو پورا فرما دیجیے۔ میرے مولا! ہمارے دلوں کو ایک مرتبہ محبت کی نظر سے دیکھ لیجیے۔ اللہ! صرف ایک مرتبہ اس مجمع کو محبت کی نظر سے دیکھ لیجیے۔

تری اک نگاہ کی بات ہے مری زندگی کا سوال ہے

اے اللہ! اپنی رحمت سے ہماری حاضری کو قبول فرما، ہمارے پچھلے گناہوں کو معاف فرما اور آئندہ نیکوکاری کی زندگی نصیب فرما۔ (آمین ثم آمین)

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّ لْيَبْكُوا كَثِيرًا﴾

خوفِ خدا میں رونا

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی
مجددی مدظلہم

اقتباس

دنیا کا دستور ہے کہ امپورٹڈ چیز کو زیادہ پیسے دے کر خریدتے ہیں۔اب ذرا سنیے..... یہ جو گنہگار اور خطا کار کے آنسو ہیں، یہ آسمان سے اوپر کی دنیا کے لیے امپورٹڈ چیز کی مانند ہیں۔فرشتے عبادت کر سکتے ہیں لیکن ندامت کا رونا نہیں رو سکتے۔عرش کے اوپر یہ جنس نہیں ہے۔یہ نعمت وہاں نہیں ہے۔لہذا جب کسی بندے کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو نکلتے ہیں تو فرشتے ان کو امپورٹڈ چیز کی مانند اٹھا کر اللہ کے حضور پیش کر دیتے ہیں۔

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

خوفِ خدا میں رونا

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
﴿فَلْیَضْحَکُوْا قَلِیْلًا وَّ لْیَبْکُوْا کَثِیْرًا۔ جَزَآءً بِّمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ﴾
سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّم

بکاء کا لغوی معنیٰ:

بُـکَـاءٌ عربی زبان کا ایک لفظ ہے جو قرآن مجید میں بھی استعمال ہوا اور حدیث مبارکہ میں بھی۔ اس کا لفظی معنیٰ ہے، رونا۔ یہ لفظ دو طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ اکثر قصر کے ساتھ بُکَاءٌ ہوتو اس کا معنیٰ ہوتا ہے، فقط آنسوؤں کا نکلنا۔ اور اگر مد کے ساتھ ہو، بُـکَـآءٌ تو پھر اس کا معنیٰ ہوتا ہے آواز بھی نکالنا اور رونا بھی۔ چنانچہ فرمایا:

وَھُوَ بِالْقَصْرِ خُرُوْجُ الدَّمْعِ فَقَطْ وَ بِالْمَدِّ خُرُوْجُ الدَّمْعِ مَعَ الصَّوْتِ

اصطلاحی تعریف:

اصطلاحاً، جب انسان کے دل پر کوئی خوف ہوتا ہے یا حزن ہوتا ہے تو اس کے اظہار کی وجہ سے آنکھوں سے جو پانی نکلتا ہے، اس کو رونا کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

اِرَاقَةُ الدُّمُوْعِ مِنْ اَثَرِ الْخَوْفِ مِنَ اللّٰهِ اَوْ لِلتَّعْبِيْرِ عَنْ حُزْنٍ فِي الْفُؤَادِ

تو غم سے بھی آنسو نکلتے ہیں اور خوف سے بھی آنسو نکلتے ہیں۔

رونے کی اقسام

علما نے اس رونے کو تفصیل سے بیان کیا اور بتایا کہ رونے کی سات اقسام ہیں۔

عَنْ يَزِيْدِ بْنِ مَيْسَرَةَ قَالَ: اَلْبُكَاءُ مِنْ سَبْعَةِ اَشْيَاءَ

''یزید بن میسرہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: رونا سات وجوہات کی بنا پر ہوتا ہے۔''

(۱)......خوشی کی وجہ سے رونا:

اَلْبُكَاءُ مِنَ الْفَرْحِ

''خوشی کی وجہ سے آنکھوں میں آنسو آ جانا۔'' جیسے:

...... باپ کو اطلاع ملے کہ آپ کا بیٹا ہوا ہے تو خوشی سے آنسو آ جاتے ہیں،

...... طالب علم کو اطلاع ملے کہ جناب! آپ پورے جامعہ میں فرسٹ آ گئے تو خوشی سے آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

یعنی جب کوئی بھی (غیر متوقع) نعمت ملتی ہے تو خوشی کی بنا پر انسان کی آنکھوں میں سے آنسو آ جاتے ہیں۔

(۲)......غم کی وجہ سے رونا:

اَلْبُكَاءُ مِنَ الْحُزْنِ

''غم کی وجہ سے رونا''۔ جب بھی کسی بندے پر کوئی مصیبت آتی ہے تو آنکھوں میں سے آنسو آ جاتے ہیں۔ مثلاً

......کسی کو کاروبار میں (نقصان) ہو گیا......آنکھوں میں آنسو،

......کوئی بچہ فیل ہو گیا......آنکھوں میں آنسو،

......ماں کا بیٹا فوت ہو گیا......آنکھوں میں آنسو۔

جب دل محزون ہوتا ہے تو پھر آنکھیں برسنے لگ جاتی ہیں۔ جیسے انسان کسی ایسے شخص کو یاد کرے جس سے بہت محبت ہو تو اسے یاد کرنے سے بھی آنسو آ جاتے ہیں۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پردہ فرمانے کے بعد مسجد نبوی میں اذان دینا بند کر دی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے میں اذان دیتا تھا تو اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار بھی کرتا تھا۔ اب میں اذان دونگا اور دیدار نہ کر سکوں گا تو یہ غم مجھ سے برداشت ہی نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے اذان ہی نہ دی۔

جب بیت المقدس فتح ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل میں یہ شوق پیدا ہوا کہ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا موذن اس قبلہ کے اندر بھی اذان دے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم فرمایا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے لیے انکار کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ لہٰذا حکم کی تعمیل کی۔ اور دوسری اذان کا واقعہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں بلال رضی اللہ عنہ کو نبی علیہ السلام کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”بلال! کتنی سرد مہری ہے کہ ہمیں ملنے ہی نہیں آتے۔“

بس یہ غم ایسا تھا کہ تڑپ گئے اور جب آنکھ کھلی تو بیوی سے کہا: ابھی تیاری کرو۔ چنانچہ تیاری کر کے شام سے مدینہ کی طرف نکل پڑے۔

جب مسجد نبوی میں آئے تو پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: جی! آپ اذان دے دیں۔ لیکن بلال رضی اللہ عنہ نے ان کو انکار کر دیا۔ پھر حسن و حسین رضی اللہ عنہما، دونوں شہزادے

تشریف لائے۔ انہوں نے بھی آ کے فرمائش کی کہ ہمیں نانا جان کے زمانے کی اذان سنائیں۔ اب ان کی یہ فرمائش ایسی تھی کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ چنانچہ دوسری اذان انہوں نے اس وقت کہی۔

کہتے ہیں کہ جب انہوں نے اذان دینی شروع کی تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یاد تازہ ہوگئی۔ دل تڑپ گئے کہ ایک زمانہ تھا کہ جب آقا صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے، اذان ہوا کرتی تھی، ہم انتظار میں ہوتے تھے کہ وہ نماز پڑھانے کے لیے تشریف لائیں گے۔ چنانچہ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جب اذان کی آواز گھروں تک پہنچی تو گھر کی عورتیں حیران ہوئیں کہ یہ تو بلال کی اذان ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی سروں پر چادریں لیں اور وہ بھی مسجد نبوی کے باہر پہنچ گئیں۔ اب اندر مرد رو رہے ہیں اور باہر عورتیں رو رہی ہیں اور معاملہ اس وقت عجیب بنا جب ایک عورت نے اپنے بیٹے کو اٹھایا ہوا تھا اور اس بیٹے نے اپنی ماں سے یہ پوچھا: ''امی! بلال رضی اللہ عنہ تو کچھ عرصے کے بعد واپس آ گئے ہیں، بتاؤ! نبی علیہ السلام کب واپس آئیں گے۔'' اللہ اکبر کبیرا

یہ حزن کے آنسو کہلاتے ہیں۔

(۳)......وَالْفَزَع

وَالْفَزَعِ ''ڈر کی وجہ سے آنسو'' ڈر کسی بھی قسم کا ہو سکتا ہے۔ مثلاً جان، مال یا عزت کے جانے کا ڈر ہو یا کسی بھی قسم کے نقصان کا خدشہ ہو تو آنسو آ جاتے ہیں۔

بعض دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ کوئی غلطی یا نقصان کر دے تو رونا شروع کر دیتا ہے کیونکہ اسے پتہ ہوتا ہے کہ اب مجھے امی ابو ماریں گے۔ اسی طرح چھوٹے بچے کو ڈاکٹر ٹیکہ دکھائے تو وہ رونا شروع کر دیتا ہے، اس لیے کہ درد ہوگا۔ حالانکہ درد ابھی

ہوا نہیں اور اتنا زیادہ ہوتا بھی نہیں، مگر ٹیکے کا خوف اتنا ہوتا ہے۔

(۴)......ریا کی وجہ سے رونا:

وَالرِّیَاءِ۔ ''ریا کی وجہ سے آنسو''۔ ''دکھاوے کے آنسو''۔ ان کو مگرمچھ کے آنسو کہا جاتا ہے۔ کروکوڈائل ٹیئرز۔ اس کی دلیل قرآن عظیم الشان سے سنیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا۔ مگر ڈالنے کے بعد پھر کام کیا کیا؟

﴿وَجَاءُوْا اَبَاهُمْ عِشَاءً يَّبْكُوْنَ﴾ (یوسف:۱۶)

''وہ عشا کے وقت باپ کے پاس روتے آئے''

یہ جھوٹ موٹ اور دکھاوے کا رونا تھا۔

(۵)......درد کی وجہ سے رونا:

وَالْوَجْعِ۔ ''درد کی وجہ سے رونا''۔ بندے کو کہیں بھی چوٹ لگے تو آنکھوں میں سے آنسو آجاتے ہیں۔ کیونکہ درد جو ہو رہی ہوتی ہے۔ کبھی گردے کے درد والے مریض کو دیکھیں درد سے اس کی کیا حالت ہوتی ہے! ایسی حالت میں آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔

(۶)......شکر کی وجہ سے رونا:

وَالشُّكْرِ۔ ''شکر کی وجہ سے رونا''۔ بسا اوقات تشکر کی وجہ سے آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے: یا اللہ! تو نے مجھے بن مانگے کیا کیا نعمتیں عطا کی ہیں۔

ایک اللہ والے جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک پتھر کو روتے ہوئے دیکھا۔ تو اس سے پوچھا: تم کیوں رو رہے ہو؟ اس نے جواب دیا: میں نے سنا ہے کہ جہنم میں

پتھروں کو ڈالا جائے گا، مجھ پر یہ خوف غالب ہے کہ کہیں میں بھی انہی پتھروں میں سے نہ ہوں، اس لیے میں رو رہا ہوں۔ انہوں نے یہ سن کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی: اے اللہ! اس پتھر کو جہنم میں نہ ڈالیے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کر لی اور انہوں نے پتھر کو بتا دیا کہ تو جہنم میں نہیں ڈالا جائے گا اور وہاں سے چلے گئے۔

اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیں کہ کچھ عرصے کے بعد ان کا جب دوبارہ وہاں سے گزر ہوا تو دیکھا کہ وہ پتھر پھر رو رہا تھا۔ انہوں نے پوچھا: جی! اب رونے کا کیا مطلب؟ تو اس نے کہا:

"ذٰلِكَ بُكَاءُ الْخَوْفِ وَ هٰذَا بُكَاءُ الشُّكْرِ وَالسُّرُوْرِ"

''وہ خوف کا رونا تھا اور یہ شکر اور سرور کا رونا ہے۔''

(۷)......خشیتِ الٰہی کی وجہ سے رونا:

وَبُكَاءٌ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

''خشیتِ الٰہی کی وجہ سے آنسو نکلنا''۔ واقعی! جب انسان اللہ رب العزت کی عظمتوں کو یاد کرتا ہے اور اپنے اعمال پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی آنکھوں میں سے آنسو آ جاتے ہیں۔ سوچتا ہے کہ میں کہیں محروم نہ ہو جاؤں۔

ام المومنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں اپنے والد عمر رضی اللہ عنہ کے گھر میں تھی۔ نبی علیہ السلام میرے پاس وہاں تشریف لے آئے۔ جب دیر ہو گئی تو ارادہ کیا کہ یہیں سو جاتے ہیں۔ پھر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام میرے بستر پر آ کر لیٹ گئے۔

فرماتی ہیں کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرے رخسار پر کوئی گرم گرم سی چیز ہے۔ جب میں نے غور کیا تو وہ آنسو تھے۔ میں فوراً اٹھ بیٹھی۔ چونکہ دونوں ایک ہی تکیے پر سر رکھ کر سو رہے تھے اس لیے محسوس کیا کہ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک آنسو تکیے پر گر رہے تھے اور وہ گیلا پن ان کو محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے چونک کر

پوچھا:

مَایُبْکِیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟

''اے اللہ کے نبی ﷺ! آپ کیوں رو رہے ہیں؟''

تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: تم نے سنا نہیں کہ تمہارا بھائی صحن میں تہجد پڑھ رہا ہے اس نے ابھی قرآن کی کون سی آیت پڑھی ہے؟ فرماتی ہیں کہ جب میں نے غور کیا تو عبداللہ بن عمر تہجد کی نماز میں پڑھ رہے تھے

﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ (المطففین: ۱۰)

''ہرگز نہیں، یہ لوگ قیامت کے دن اللہ رب العزت سے حجاب میں ہوں گے۔''

یعنی ان کو اللہ رب العزت کا دیدار نصیب نہیں ہوگا۔ جب نبی علیہ الصلوٰۃ و السلام نے یہ مضمون سنا تو آپ ﷺ کی مبارک آنکھوں سے آنسو آگئے کہ یہ کتنی بدنصیبی ہے کہ انسان اللہ رب العزت کے دیدار سے قیامت کے دن محروم ہو جائے گا۔

بکاء کا حکم:

بکاء کا حکم کیا ہے؟ بکا کا حکم یہ ہے کہ کچھ بکا اچھی ہیں اور کچھ بکا ٹھیک نہیں۔

اَلْبُکَاءُ بَیْنَ الْمَدْحِ وَالذَّمِّ

چنانچہ اگر تو بندہ!......اپنے گناہوں کو یاد کر کے روئے

......اللہ رب العزت کی عظمت کو سامنے رکھ کر روئے

......احساس تشکر کی وجہ سے روئے،

......قران مجید میں تدبر کی وجہ سے روئے،

تو یہ ساری بکا محمود کہلاتی ہیں اور اگر ریا کی وجہ سے روئے تو یہ مذموم کہلائے

گی۔خلاف شرع کہلائے گی۔

باقی یہ انسان کی فطرت ہے کہ غم آتا ہے یا جدائی ہوتی ہے تو آنکھوں سے آنسو آجاتے ہیں۔اللہ کے پیارے حبیب ﷺ اپنے پیارے صاحب زادے سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ کو دفن فرما رہے ہیں اور مبارک آنکھوں میں آنسو ہیں۔تو ایک صحابیؓ پوچھتے ہیں: اے اللہ کے نبی ﷺ! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ تو فرمایا:

((اَلْقَلْبُ يَحْزُنُ وَالْعَيْنُ تَدْمَعُ وَاَنَابِفِرَاقِكَ يَا بْرَاهِيمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ))

''دل مغموم ہے،آنکھوں سے آنسو چھلک رہے ہیں اور اے ابراہیم! تیری جدائی میں ہم بہت مغموم ہیں۔''

مبارک ہو اس شخص کو.......:

ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

طُوْبٰى لِمَنْ مَلَكَ نَفْسَهٗ وَ وَسِعَهٗ بَيْتُهٗ وَبَكٰى عَلٰى خَطِيْئَتِهٖ

''مبارک ہو اس شخص کو جس کا نفس اس کے قابو میں ہو،اس کا گھر وسیع ہو،اور اس کو اپنے گناہوں پر رونا آتا ہو۔''

اس حدیث مبارکہ میں نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ جس بندے میں تین خوبیاں ہوں اس کو مبارک ہو۔

(۱)......جو اپنے نفس پر کنٹرول رکھتا ہو۔اپنے اندر کی غلط قسم کی Temptation (طلب) کی مزاحمت کرنے کی پاور رکھتا ہو۔

(۲)......اس کا گھر ایسا ہو کہ باہر نکلنے کو اس کا دل ہی نہ کرے۔نکلے تو با مقصد نکلے۔کئی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ انہوں نے روڈ کا لائسنس بنوایا ہوتا ہے۔ان کی زندگی کا اکثر وقت ہی سڑکوں اور گلیوں میں گزرتا ہے۔

(۳)......وہ اپنی خطاؤں پر شرمندہ ہو کر روئے۔کیونکہ اپنی خطاؤں کو یاد کر کے رونا

بہت ہی محبوب چیز ہے۔ اس سے انسان کا دل دُھلتا ہے اور گناہ ختم ہوتے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے سخت ترین دن:

انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

((عُرِضَتْ عَلَيَّ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ، فَلَمْ اَرَ كَالْيَوْمِ فِي الْخَيْرِ وَ الشَّرِّ، وَ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا، قَالَ فَمَا اَتٰى عَلٰى اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَوْمٌ اَشَدُّ مِنْهُ، قَالَ غَطَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَلَهُمْ خَنِيْنٌ))

”مجھے جنت اور جہنم دکھائی گئی۔ آج کے دن کی طرح میں نے خیر اور شر نہیں دیکھا (یعنی جنت سے زیادہ کوئی خیر نہیں اور جہنم سے زیادہ کوئی شر نہیں)۔ جو میں جانتا ہوں، اگر تم جان لیتے تو تم زیادہ روتے اور تھوڑا ہنستے۔ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام کے صحابہ پر اس سے زیادہ سخت دن کوئی نہیں تھا۔ بس نبی علیہ السلام نے یہ بات کہی تو صحابہ رضی اللہ عنہ نے اپنے سر ڈھانپ لیے اور سسکیوں کی ساتھ ان کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔“

جب صحابہ رضی اللہ عنہم نبی علیہ السلام سے بات سنتے تھے تو ان کے دل کی کیفیت فوراً ایسے ہو جاتی تھی۔

جہنم سے محفوظ دو آنکھیں:

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

"عَيْنَانِ لَا تَمَسُّهُمَا النَّارُ: عَيْنٌ بَكَتْ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَ عَيْنٌ

بَاتَتْ تَحْرُسُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))

''دو آنکھیں ایسی ہیں جن کو جہنم کی آگ نہیں چھوسکتی: وہ آنکھ جو اللہ رب العزت کی خشیت میں روئی ہو، اور وہ آنکھ جو اللہ کے راستے میں پہرہ دیتے ہوئے (رات کو) جاگی ہو۔''

سبحان اللہ! اللہ کی خشیت کی وجہ سے اور اپنے گناہوں کو یاد کر کے رونا، اللہ کو بہت پسندیدہ ہے۔

رونا اللہ تعالیٰ کو کیوں پسند ہے؟

یہاں ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اللہ کی خشیت کی وجہ سے رونا اس قدر کیوں پسندیدہ ہے؟......تو بھئی! سنیے کہ اس قدر پسندیدہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی چیز کہیں نہ ملتی ہو تو اس کی پرائس (قیمت) زیادہ بن جاتی ہے۔ اور اگر بیرون ملک کی چیز ہو تو پھر اور بھی مہنگی ملتی ہے۔ کیونکہ وہ امپورٹڈ چیز ہوتی ہے۔

ایک بندہ کوئی سیٹی خرید کر لایا۔ پوچھا گیا: بھئی! اتنا مہنگا کیوں خریدا ہے؟ جواب ملا: جی! امپورٹڈ چیز مل رہی تھی اس لیے میں نے زیادہ پیسے دے کر خرید لی۔ گویا دنیا کا دستور ہے کہ امپورٹڈ چیز کو زیادہ پیسے دے کر خریدتے ہیں۔

اب ذرا سنیے۔ یہ جو گنہگار اور خطا کار کے آنسو ہیں، یہ آسمان سے اوپر کی دنیا کے لیے امپورٹڈ چیز کی مانند ہیں۔ فرشتے عبادت کر سکتے ہیں لیکن ندامت کا رونا نہیں رو سکتے۔ عرش کے اوپر یہ جنس نہیں ہے۔ یہ نعمت وہاں نہیں ہے۔ لہٰذا جب کسی بندے کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو نکلتے ہیں تو فرشتے ان کو امپورٹڈ چیز کی مانند اٹھا کر اللہ کے حضور پیش کر دیتے ہیں۔

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

رب کے خزانوں میں چار چیزوں کی کمی!!!

ایک مجذوب ایک شعر پڑھتے تھے:

چہار چیز آوردہ ام شاہا در گنج تو نیست

''اے اللہ! چار چیزیں میرے پاس ایسی ہیں جو تیرے خزانے میں بھی نہیں ہیں۔''

لوگ سن کر حیران ہوتے کہ یہ مجذوب کیا کہتا پھر رہا ہے۔ وہ بس یہی ایک ہی مصرعہ پڑھتا رہتا تھا۔ ایک نوجوان ان کے پیچھے لگ گیا کہ پوچھیں تو سہی کہ آخر یہ کہتا کیا ہے۔ جب اس نے پوچھا تو اس نے بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ ادھر سے اصرار اور ادھر سے انکار۔ مگر کچھ لوگ لسوڑھے کی گٹھلی کی طرح ہوتے ہیں۔ ان سے جان چھڑانا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بھی ایسے ہی پیچھے پڑ گیا۔ حتی کہ اس مجذوب نے اپنا شعر مکمل پڑھ کے سنایا:

چہار چیز آوردہ ام شاہا در گنج تو نیست
نیستی و حاجت و عذر و گناہ و آوردہ ام

کہ میرے پاس نیستی ہے، آپ کے پاس نیستی نہیں ہے، میرے پاس محتاجی ہے آپ کے پاس محتاجی نہیں ہے، میں عذر پیش کرتا ہوں اور آپ کو کسی کے سامنے عذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور میں خطا کر بیٹھتا ہوں، اے پروردگار! آپ کا خزانہ ان چیزوں سے خالی ہے۔.....

واقعی! یہ ندامت کے آنسو ایسی چیز ہیں کہ جو اوپر کے خزانوں میں نہیں ہے۔ اس لیے یہ اللہ کو بڑے پسند ہیں۔ یوں سمجھیں کہ امپورٹڈ چیز کی طرح اللہ تعالیٰ ان کا خوب ریٹ لگاتے ہیں۔

چشمہ اور چشم کے پانی میں فرق:

''عین'' کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ایک ، چشمہ کے لیے۔قرآن مجید میں فرمایا:

﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ (المطففین:۲۸)

اور دوسرا چشم کے لیے۔یعنی آنکھوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

چشمے سے بھی پانی نکلتا ہے اور چشم میں سے بھی پانی نکلتا ہے۔لیکن دونوں کے پانی میں فرق ہوتا ہے۔

- ...... جو چشمے سے نکلا وہ پانی کہلایا اور جو چشم سے نکلا وہ آنسو کہلایا،
- ...... جو چشمہ سے نکلا اس نے جسم کی پیاس بجھائی اور جو چشم سے نکلا اس نے روح کی پیاس کو بجھایا۔
- ...... جو چشمہ سے نکلا اس سے دنیا کے گلشن آباد ہوئے اور جو چشم سے نکلا اس سے من کے گلشن آباد ہوئے۔
- ...... جو چشمہ سے نکلا اس نے ظاہر کی گندگی کو دھو ڈالا اور جو چشم سے نکلا اس نے من کی گندگی کو دھو ڈالا۔
- ...... جو چشمہ سے نکلا اس نے دنیا کی آگ کو بجھا ڈالا اور جو چشم سے نکلا اس نے جہنم کی آگ کو بجھا ڈالا۔

دل کیسے دھلتا ہے؟

ایک مرتبہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف وحی نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''میرے پیارے ابراہیم! تو اپنے دل کو دھولیا کر۔''

ابراہیم علیہ السلام حیران ہو کر پوچھتے ہیں: اللہ! پانی تو وہاں پہنچتا نہیں ، میں اپنے دل

کو کیسے دھوؤں؟ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''میرے خلیل! یہ دل دنیا کے پانی سے نہیں دھلتا، یہ تو ندامت سے نکلے ہوئے آنسوؤں سے دھلا کرتا ہے۔''

کاش! ہمارا بھی کوئی ایک آنسو ایسا ہو جو ہمارے مالک کو پسند آجائے ؎

ادھر نکلے ادھر ان کو خبر ہو
کوئی آنسو تو ایسا معتبر ہو

کوئی ایک معتبر آنسو ہی آنکھ سے نکال جاتے۔ تڑپ کے روتے۔ ندامت کے ساتھ روتے اور مالک کو ترس آجاتا۔

اس حدیث مبارکہ میں آگے فرمایا:

((وَعَيْنٌ بَاتَتْ تَحْرُسُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))

''اور وہ آنکھ جو اللہ کے راستے میں رات کو پہرہ دینے کے لیے جاگی۔''

اللہ رب العزت ایسی آنکھ پر بھی جہنم کی آگ کو حرام فرما دیتے ہیں۔ سبحان اللہ!

اللہ کے لیے رونے کی فضیلت:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

لَا يَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ بَكٰى مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ حَتّٰى يَعُوْدَ اللَّبَنُ فِي الضَّرْعِ

''جہنم کی آگ، اللہ کے لیے رونے والے بندے کو چھو نہیں سکتی جب تک کہ دودھ تھنوں میں واپس نہ چلا جائے۔''

اب دودھ تو تھنوں میں واپس جا نہیں سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رونے والے بندے کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکے گی۔ اور آگے فرمایا:

وَ لَا يَجْتَمِعُ غُبَارٌ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَدُخَانُ جَهَنَّمَ

''اور جس جسم پر اللہ کے راستے کی مٹی لگ گئی ہوگی اس کے اوپر جہنم کی آگ جمع نہیں ہوگی۔''

دو محبوب قطرے اور دو محبوب نشان:

ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

لَيْسَ شَيْءٌ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ قَطْرَتَيْنِ وَ اَثَرَيْنِ قَطْرَةٌ مِنْ دُمُوْعٍ فِيْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَ قَطْرَةُ دَمٍ تُهْرَاقُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اَمَّا الْاَثَرَانِ فَاَثَرٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اَثَرٌ فِيْ فَرِيْضَةٍ مِّنْ فَرَائِضِ اللّٰهِ

''کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کو دو قطروں سے زیادہ اور دو نشانوں سے زیادہ پسندیدہ نہیں۔ ایک تو آنسو کا وہ قطرہ جو اللہ کے خوف سے نکلا ہو اور دوسرا خون کا قطرہ جو اللہ کے راستے میں بہایا گیا ہو۔ اور جو دو نشان ہیں (وہ یہ ہیں) ایک وہ جو نشان اللہ کے راستے میں لگا ہو اور دوسرا وہ نشان جو اللہ کے فرائض ادا کرتے وقت لگے۔''

جیسے بعض لوگوں کو التحیات میں بیٹھنے کی وجہ سے ٹخنوں پہ نشان پڑ جاتے ہیں، گھٹنوں پر بھی نشان پڑ جاتا ہے۔ سجدے کی جگہ یعنی پیشانی پر نشان پڑ جاتا ہے۔ یہ فرض ادا کرتے ہوئے جو نشان پڑا، یہ میرے مالک کو بہت پیارا لگتا ہے۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

مَنْ ذَكَرَ اللّٰهُ فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ حَتّٰى يُصِيْبَ الْاَرْضَ مِنْ دُمُوْعِهٖ لَمْ يُعَذِّبْهُ اللّٰهُ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

''جو بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں حتی کہ وہ

آنسو زمین پر پہنچ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس بندے کو کبھی عذاب نہیں دے گا۔'' سبحان اللہ!

آنکھیں بہہ پڑیں اور دل تڑپ گئے:

عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

((وَعَظَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَوْمًا بَعْدَ صَلٰوةِ الْغَدَاةِ مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ وَ وَجِلَتْ مِنْهُ الْقُلُوْبُ فَقَالَ رَجُلٌ اِنَّ هٰذِهٖ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَبِمَاذَا تَعْهَدُ اِلَيْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ وَ اِنْ عَبْدٌ حَبْشِيٌّ فَاِنَّهٗ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ يَرَ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا، وَ اِيَّاكُمْ وَ مُحْدَثَاتُ الْاُمُوْرِ فَاِنَّهَا ضَلَالَةٌ فَمَنْ اَدْرَكَ ذَالِكَ مِنْكُمْ فَعَلَيْهِ بِسُنَّتِيْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ))

''ایک دن نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں فجر کی نماز کے بعد وعظ فرمایا۔ وہ بڑا موثر وعظ تھا، آنکھیں بہہ پڑیں اور دل تڑپ گئے۔ ایک صاحب نے سن کر کہا: یہ تو کوئی الوداعی وعظ لگتا ہے (جیسے کوئی وصیت کے رنگ میں نصیحت کرتا ہے)...... پھر نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، اور سنو اور عمل کرو (سنو اور مانو) اگرچہ تمہارا امیر کوئی حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ تم میں سے جو کوئی لمبی عمر والا ہوا، وہ میرے بعد (امت میں) بڑے اختلافات دیکھے گا۔ اور تم بدعات (نئی نئی چیزوں) سے بچو کہ وہ گمراہی ہے۔ جو ایسا وقت پالے اس کو چاہیے کہ وہ میری سنت پر بھی عمل کرے اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت پر بھی عمل کرے۔ تم ان صحابہ کے عمل کو اپنے

دانتوں سے مضبوطی سے پکڑ لو۔“

خلفائے راشدین کا عمل سنت ہے:

اب یہاں ایک نکتہ سمجھیے کہ نبی علیہ السلام نے خلفائے راشدین کے عمل کے لیے سنت کا لفظ ارشاد فرمایا۔ فرمایا:

((وَسُنَّةُ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ))

یہ حدیث مبارکہ اس پر دلیل ہے۔ اسی وجہ سے ہم اپنے آپ کو اہلِ سنت والجماعت کہتے ہیں۔ کیا مطلب؟ کہ ہم نبی علیہ السلام کی سنت پر بھی عمل کرتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کی طرف سے اگر کوئی عمل ثابت ہو تو ہم اس پر بھی عمل کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ بھی سنت ہے، نبی علیہ السلام خود فرماتے ہیں۔

((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ))

آج کل انٹرنیٹ کا دین آ گیا ہے۔ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں: ہم کسی کی نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں: بیس رکعت تراویح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بدعت ہے۔

اب ان کا مبلغ علم دیکھیں کہ نبی علیہ السلام تو عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کو سنت کا نام دیں اور یہ انٹرنیٹ سے دین سیکھنے والا ان کے عمل کو بدعت کہتا ہے۔

﴿فَمَا لِهٰٓؤُلَاۤءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾

جہنم سے کیسے بچیں؟

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

قَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! بِمَ اتَّقِى النَّارَ؟

”ایک آدمی نے پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم جہنم کی آگ سے کیسے بچ سکتے ہیں؟

کتنا پیارسوال پوچھا! ٹو دی پوائنٹ سوال کیا۔

((قَالَ: بِدُمُوْعِ عَيْنَيْكَ، فَإِنَّ عَيْنًا بَكَتْ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ لَا تَمَسُّهَا النَّارُ اَبَدًا

''نبی علیہ السلام نے فرمایا: اپنی آنکھ سے نکلے ہوئے آنسوؤں کے ذریعے۔ جس آنکھ سے اللہ کے خوف کی وجہ سے آنسو نکلتا ہے، اس آنکھ کو جہنم کی آگ چھو بھی نہیں سکے گی۔''

سبحان اللہ! کتنی وضاحت اور صراحت کے ساتھ بتایا گیا لیکن اگر آج ہماری آنکھوں کے چشمے خشک ہیں تو یہ ہمارے لیے بہت بڑا الارم ہے۔ خطرے کا نشان ہے۔ اور اگر کوشش کے باوجود بھی آنکھوں سے آنسو نہیں آتے تو

فَإِنَّهَا مِنْ اَعْظَمِ الْمَصَائِبِ

''یہ عظیم مصیبت ہے''

جب دل کی بجائے سینے میں سل ہو تو پھر آنکھوں سے کچھ نہیں نکلا کرتا۔ یہ دل کی سختی انسان کی آنکھوں سے آنسوؤں کو نکلنے سے روک دیتی ہے۔ اور جب سینوں میں دل ہوتا ہے تو پھر آنکھ سے آنسو بھی نکلتے ہیں۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

عَيْنٌ بَكَتْ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ لَا تَمَسُّهَا النَّارُ اَبَدًا

''جہنم کی آگ اس آنکھ کو چھو ہی نہیں سکتی جو اللہ کی خشیت کی بنا پر روتی ہے۔''

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے نبی علیہ السلام کا یہ فرمان پہنچا۔

مَا مِنْ قَطْرَةٍ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ قَطْرَةٍ مِّنْ دَمٍ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَقَطْرَةِ دُمُوْعٍ قَطَرَتْ مِنْ عَيْنِ رَجُلٍ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

''اللہ کے راستے میں خون کا جو قطرہ بہتا ہے اس سے زیادہ کوئی قطرہ اللہ کو پسند نہیں۔اور وہ آنسو کا قطرہ جو رات کے آخری پہر میں کسی مومن بندے کی آنکھ سے اللہ کے خوف کی وجہ سے نکلا ہو، اللہ کو وہ قطرہ بہت پسند ہے۔''

رونے والا ایک، بخشش سب کی......!!!

حضرت نضر رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔وہ فرماتے ہیں:

مَا اغْرَوْرَقَتْ عَيْنَا عَبْدٍ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ جَسَدَهَا عَلَى النَّارِ فَاِنْ فَاضَتْ عَلٰى خَدِّهٖ لَمْ يَرْهَقْ وَجْهَهٗ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ وَلَوْ اَنَّ عَبْدًا بَكٰى فِيْ اُمَّةٍ مِنَ الْاُمَمِ لَاَنْجَى اللّٰهُ بِبُكَاءِ ذٰلِكَ الْعَبْدِ تِلْكَ الْاُمَّةَ مِنَ النَّارِ وَمَا مِنْ عَمَلٍ اِلَّا لَهٗ وَزْنٌ اَوْ ثَوَابٌ اِلَّا الدَّمْعَةَ فَاِنَّهَا تُطْفِئُ بُحُوْرًا مِّنَ النَّارِ

''جب کسی کی آنکھ سے آنسو اللہ کی خشیت کی وجہ سے نکلتا ہے تو آنسو کے نکلتے ہی اللہ تعالیٰ اس کے جسم کو جہنم کی آگ پر حرام فرما دیتے ہیں۔اگر وہ آنسو اس کے رخسار کے اوپر بہہ پڑے تو ایسے چہرے کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ذلیل و رسوا نہیں فرمائیں گے اور اگر کسی بڑی جماعت میں سے کوئی ایک بندہ روتا ہے تو اس ایک بندے کے رونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پوری جماعت کو جہنم کی آگ سے نجات عطا فرما دیتے ہیں۔(سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ کتنے قدردان ہیں کہ اگر پوری جماعت میں سے ایک بندہ بھی رو پڑتا ہے تو اس ایک کی برکت سے پاس بیٹھنے والے بھی محروم نہیں رہتے) ہر عمل کا وزن ہوتا ہے اور ہر عمل کا ثواب ہوتا ہے، سوائے انسان کے ندامت سے نکلے ہوئے آنسوؤں کے، اس لیے کہ آنسو کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ کے سمندروں کو بجھا دیتے ہیں۔''

اللہ اکبر! آنسو کا ایک قطرہ جہنم کی آگ کے سمندروں کو بھی بجھا دیتا ہے۔

ندامت کے آنسوؤں کا وزن:

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بَلَغَنَا اَنَّ الْبَاکِیَ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ لَا یَقْطُرُ مِنْ دُمُوْعِہٖ قَطْرَۃٌ عَلَی الْاَرْضِ حَتّٰی تُعْتَقُ رَقَبَتُہٗ مِنَ النَّارِ وَلَوْ اَنَّ بَاکِیًا بَکٰی فِیْ مَلَاءٍ مِنْ مَلَاءٍ لَرُحِمُوْا جَمِیْعًا بِبُکَائِہٖ وَلَیْسَ شَیْءٌ اِلَّا لَہٗ وَزْنٌ اِلَّا الْبُکَاءُ فَاِنَّہٗ لَا یُوْزَنُ

''یہ بات ہمیں پہنچی ہے کہ جو اللہ کی خشیت کی وجہ سے روتا ہے، اس کے آنسو کا قطرہ زمین پر نہیں گرتا، مگر یہ کہ اس کی گردن آگ سے آزاد کر دی جاتی ہے۔ اور اگر کسی جماعت میں سے کوئی ایک بندہ بھی رویا تو اللہ اس ایک کے رونے کی وجہ سے سب پر رحم فرما دیتے ہیں۔ اور ہر چیز کا وزن ہوتا ہے، سوائے گنہگار کے آنسوؤں کے، کہ میزان کے اندر ان آنسوؤں کے وزن کو تولا ہی نہیں جا سکتا۔'' چنانچہ جبرئیل علیہ السلام فرماتے کہ ہم بندے کے ہر عمل کو تو لتے ہیں سوائے گنہگار کے آنسوؤں کے، کہ ان کو ہم میزان میں تول ہی نہیں سکتے۔ وہ میزان میں اتنے بھاری ہوتے ہیں

زیادہ ہنسنے کی مذمت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

خَرَجَ نَبِیٌّ صلی اللہ علیہ وسلم ذَاتَ یَوْمٍ مِنَ الْمَسْجِدِ فَاِذَا قَوْمٌ یَتَحَدَّثُوْنَ وَ یَضْحَکُوْنَ فَوَقَفَ وَسَلَّمَ عَلَیْھِمْ، ثُمَّ قَالَ: اَکْثِرُوْا ذِکْرَ ھَاذِمِ اللَّذَّاتِ ثُمَّ خَرَجَ بَعْدَ ذَالِكَ مَرَّۃً اُخْرٰی فَاِذَا قَوْمٌ یَضْحَکُوْنَ قَالَ

اَمَا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِکْتُمْ قَلِیْلًا وَ لَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا وَ لَمَّا اَرَادَ الْخَضِرُ اَنْ یُفَارِقَ مُوْسٰی قَالَ لَهٗ عِظْنِیْ قَالَ یَا مُوْسٰی اِیَّاكَ وَاللِّجَاجَةَ وَ لَا تَمْشِ بِغَیْرِ حَاجَةٍ ، وَلَا تَضْحَكْ مِنْ غَیْرِ عُجُبٍ وَ لَا تُعَیِّرِ الْخَطَّائِیْنَ بِخَطَایَاهُمْ وَابْكِ عَلٰی خَطِیْئَتِكَ وَ قَالَ صلی اللہ علیہ وسلم كَثْرَةُ الضَّحِكِ تُمِیْتُ الْقَلْبَ وَ قَالَ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ ضَحِكَ لِشَبَابِہٖ بَكٰی لِهَرَمِہٖ وَ مَنْ ضَحِكَ لِغَنَاہُ بَكٰی لِفَقْرِہٖ وَ مَنْ ضَحِكَ لِحَیَاتِہٖ بَكٰی لِمَوْتِہٖ

’’ایک دن نبی علیہ السلام مسجد سے باہر تشریف لائے۔ کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ نبی علیہ السلام وہاں کھڑے ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سلام کیا۔ پھر نبی علیہ السلام نے فرمایا: لذتوں کو توڑنے والی چیز (یعنی موت) کو کثرت سے یاد کیا کرو۔ پھر ایک دن اور بھی ایسا ہی ہوا۔ اس وقت بھی لوگ ہنس رہے تھے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا: خبردار! اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر تم وہ جان لیتے جو میں جانتا ہوں تو تم زیادہ روتے اور تھوڑا ہنستے۔ (پھر نبی علیہ السلام نے آگے بھی بات بتائی۔ ارشاد فرمایا) جب خضر علیہ السلام نے "موسیٰ علیہ السلام سے جدا ہونے کا فیصلہ کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: مجھے کوئی نصیحت کر دیجیے۔ خضر علیہ السلام نے فرمایا: اے موسیٰ! تم جھگڑے سے بچو، بغیر حاجت کے مت چلو، تعجب کے بغیر مت ہنسو (البتہ کوئی بہت تعجب کی بات ہو اور بے اختیار ہنسی آ جائے تو اور بات ہے) اور تم خطا کاروں اور گنہگاروں کو عار نہ دلاؤ کہ تم نے یہ یہ کرتوت کیے ہیں۔ اور اپنے گناہوں پر روئیے۔ اور نبی علیہ السلام نے فرمایا: زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔ پھر نبی علیہ السلام نے بہت ہی قابلِ غور بات ارشاد فرمائی۔

فرمایا:

☆ جو اپنی جوانی پر ہنسے گا اس کو اپنے بڑھاپے پہ رونا پڑے گا،

☆ جو اپنی غنا (مالداری) پر ہنسے گا اس کو اپنے فقر کے اوپر رونا پڑھے گا، اور

☆ جو اپنی زندگی پر ہنسے گا، اس کو اپنی موت کے اوپر رونا پڑے گا۔

تین آنکھیں قیامت کے دن نہیں روئیں گی:

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

''تین آنکھیں ایسی ہیں جو قیامت کے دن نہیں روئیں گی (باقی ہر آنکھ کو رونا پڑے گا)۔ایک، وہ آنکھ جو اللہ کی خشیت سے روئی ہو۔ دوسری، وہ آنکھ جو اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے رک گئی ہو (یعنی غیر محرم کو دیکھنے سے رکی ہو)۔تیسری وہ آنکھ جو اللہ کے راستے میں رات کو جاگی ہو''

قساوتِ قلبی کے تین اسباب:

اور کہا گیا ہے:

''تین چیزیں دل کو سخت کرتی ہیں: بغیر تعجب کے ہنسنا، بغیر بھوک کے کھانا اور بغیر ضرورت کے باتیں کرنا۔''

ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی خطاؤں پر اللہ کے سامنے روئیں، تنہائیوں کے اندر، تہجد کے اور اندھیروں میں اللہ کے حضور گڑگڑائیں اور سسکیاں لے لے کے فریاد کریں، تاکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہو جائے۔

اللہ والے کی نصیحت کا اثر:

ایک مرتبہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے نوجوان کے پاس سے گزرے جو ہنس رہا تھا۔انہوں نے اس کو دیکھ کر فرمایا:

يَا بُنَيَّ هَلْ جُزْتَ عَلَى الصِّرَاطِ؟ قَالَ: لَا۔ قَالَ: هَلْ تَبَيَّنَ لَكَ إِنَّكَ تَصِيْرُ إِلَى الْجَنَّةِ؟ قَالَ: لَا۔ قَالَ فَفِيْمَ الضِّحْكَ؟ فَمَا رُؤِيَ الشَّابُ ضَاحِكًا بَعْدَ ذٰلِكَ

''اے بیٹے! کیا تو پل صراط سے گزر چکا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ پھر فرمایا: کیا تجھے اس بات کا پتہ چل گیا ہے کہ تو جنت میں جائے گا؟ اس نے کہا: نہیں۔ تو پھر فرمایا: پھر یہ ہنسنا کس بات کی وجہ سے ہے؟ (یہ اللہ والے کی نصیحت تھی، اس نے اپنا اثر دکھایا) کہتے ہیں: اس کے بعد وہ نوجوان اپنی پوری زندگی میں ہنستا نظر نہیں آیا۔''

اللہ اکبر! اس نوجوان کے دل میں ایک غم آ گیا کہ مجھے بھی تو پل صراط سے گزرنا ہے، ابھی تو قیامت کے دن کا فیصلہ ہونا ہے۔ جب یہ بات دل میں آ جاتی ہے تو پھر انسان کی ہنسی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر غم دل کے اوپر غالب آ جاتا ہے۔

اخلاص سے رونے والے ایسے تھے:

ہمارے اکابر اللہ کی رضا کے لیے روتے تھے اور اپنے رونے کو دوسروں سے چھپایا کرتے تھے۔ پتہ ہی نہیں چلنے دیتے تھے کہ کوئی رو رہا ہے یا نہیں۔ محمد بن واسع کہتے ہیں:

''میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا کہ آدمی کا اور اس کی بیوی کا سر ایک تکیے کے اوپر ہوتا تھا (دونوں لیٹے ہوئے ہوتے تھے) اس شخص کے آنسو اس کی رخساروں پر بہہ رہے ہوتے تھے لیکن اس کی بیوی کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا (نہ آواز نہ کوئی حرکت، بس دل میں غم ہے اور آنسو گر رہے ہیں، اس کو کہتے ہیں اخلاص کا رونا)۔ فرماتے ہیں: میں نے ایسے بندے بھی دیکھے کہ ان میں سے

ایک نماز کی صف میں کھڑا ہوتا تھا، اس کے آنسو رخساروں پر بہہ رہے ہوتے تھے اور ساتھ والے نمازی کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا (کہ یہ رو رہا ہے یا نہیں رو رہا)۔‘‘

نمازِ کسوف میں نبی رحمت ﷺ کی گریہ وزاری:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اِنْكَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلَى الصَّلٰوةِ، وَقَامَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ فَقَامَ قِيَامًا فَطَالَ الْقِيَامُ ثُمَّ رَكَعَ فَاَطَالَ الرُّكُوْعَ ثُمَّ رَفَعَ رَاْسَهٗ، وَ سَجَدَ فَاَطَالَ السُّجُوْدَ، ثُمَّ رَفَعَ رَاْسَهٗ وَ جَلَسَ فَاَطَالَ الْجُلُوْسَ، ثُمَّ سَجَدَ فَاَطَالَ السُّجُوْدَ، ثُمَّ رَفَعَ رَاْسَهٗ وَ قَامَ، فَصَنَعَ فِي الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ مِثْلَ مَاصَنَعَ فِي الرَّكْعَةِ الْاُوْلٰى مِنَ الْقِيَامِ وَالرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ وَالْجُلُوْسِ فَجَعَلَ يَنْفُخُ فِيْ اٰخِرِ سُجُوْدِهٖ مِنَ الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ وَيَبْكِيْ وَ يَقُوْلُ: لَمْ تَعِدْنِيْ هٰذَا وَ اَنَا فِيْهِمْ، لَمْ تَعِدْنِيْ هٰذَا وَنَحْنُ نَسْتَغْفِرُكَ

’’نبی علیہ السلام کے زمانے میں سورج گرہن لگ گیا۔ نبی علیہ السلام نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ساتھ کھڑے ہو گئے۔ پھر نبی علیہ السلام نے لمبا قیام کیا۔ پھر رکوع کیا تو وہ بھی لمبا رکوع کیا۔ پھر نبی علیہ السلام نے سر اٹھایا، سجدہ کیا اور لمبا سجدہ کیا۔ پھر نبی علیہ السلام نے سر اٹھایا اور جلسہ کیا، لمبا جلسہ۔ پھر دوسرا لمبا سجدہ کیا۔ پھر نبی علیہ السلام نے سر اٹھایا اور دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نبی علیہ السلام نے پہلی رکعت کی طرح دوسری رکعت میں بھی قیام، رکوع، سجدہ اور جلسہ کیا۔ پھر نبی علیہ السلام

رونے لگے۔ اور روتے ہوئے نبی علیہ السلام نے فرمایا: اے اللہ! آپ نے وعدہ نہیں فرمایا ہوا، اور میں تو ابھی ان کے اندر موجود ہوں۔ آپ نے وعدہ نہیں فرمایا ہوا اور ہم استغفار بھی کر رہے ہیں۔"

قرآن مجید کی یہ آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيهِمْ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (الانفال:۳۳)

"اے میرے پیارے حبیب ﷺ! جب تک آپ ان میں ہیں ہم ان کو عذاب نہیں دیں گے اور جب تک یہ استغفار کرتے رہیں گے اس وقت تک بھی عذاب نہیں دیں گے۔"

اللہ کے حبیب ﷺ نے اس آیت کی طرف اشارہ کیا کہ اے پروردگارِ عالم! آپ نے وعدہ نہیں فرمایا، حالانکہ میں ان میں موجود ہوں۔ آپ نے وعدہ نہیں فرمایا کہ جب تک ہم استغفار کرتے رہیں گے آپ ہمیں عذاب نہیں دیں گے۔

دیکھیے! اللہ کے پیارے حبیب ﷺ بھی سورج کی اس حالت کو دیکھ کر اللہ رب العزت کے عذاب سے کتنا خوف کھاتے تھے۔

نبی رحمت ﷺ بھی رو پڑے:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لَمَّا نَزَلَتْ ﴿اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ وَ تَضْحَكُوْنَ وَ لَا تَبْكُوْنَ﴾ بَكٰى اَصْحَابُ الصُّفَّةِ حَتّٰى جَرَتْ دُمُوْعُهُمْ عَلٰى خُدُوْدِهِمْ فَلَمَّا سَمِعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَكٰى مَعَهُمْ فَبَكَيْنَا بِبُكَائِهٖ: فَقَالَ ﷺ لَا يَلِجُ النَّارَ مَنْ بَكٰى مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، وَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ

مُصِرٌّ عَلٰی مَعْصِیَةٍ وَلَوْ لَمْ تَذْنِبُوْا لَجَاءَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ یَذْنِبُوْنَ فَیَغْفِرُلَهُمْ

''جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی ﴿اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِیْثِ تَعْجَبُوْنَ وَ تَضْحَكُوْنَ وَ لَا تَبْكُوْنَ﴾ تو اصحاب صفہ اس آیت کو سن کر رو پڑے حتیٰ کہ ان کے آنسوان کے رخساروں پر بہنے لگے۔ پھر جب نبی علیہ السلام نے اصحاب صفہ کو روتے سنا تو اللہ کے نبی ﷺ بھی ساتھ رو پڑے۔ پھر نبی علیہ السلام نے فرمایا: اس بندے کو جہنم میں نہیں ڈالا جائے گا جو اللہ کی خشیت کی وجہ سے روئے گا۔ اور جو بندہ اپنے گناہ پر بار بار اصرار کرے گا، ایسے اصرار کرنے والے کو جنت نہیں بھیجا جائے گا۔ اور اگر گناہ نہیں کرو گے تو اللہ ایسی قوم کو لے آئے گا جو گناہ کرے گی اور اللہ سے استغفار کرے گی''۔

رونے کے تین اسباب:

رونا کیسے آتا ہے؟...... یہ بات بھی سن لیجیے تاکہ ہم بھی کوشش کریں کہ ہمیں بھی وہ نعمت حاصل ہو جائے جس سے ہماری آنکھیں بھی نم ہو جائیں۔ علما نے اس کی تین وجوہات لکھی ہیں۔

⊙ ...... وہ فرماتے ہیں:

اِذَا قَلَّتْ خَطَایَاهُ سَرَعَتْ دَمْعَتُهٗ

''جب گناہ کم ہوتے ہیں تو آنسو جلدی نکلتے ہیں''

گناہوں نے آنسوؤں کے راستے کو بلاک کیا ہوتا ہے۔ اور جب راستے میں کوئی کچرا پھنسا ہوا ہو تو پھر چیز نہیں آتی۔ یہ گناہوں کا کچرا راستے میں پھنسا ہوتا ہے جس کی وجہ سے آنسو نہیں نکلتے۔ نچوڑنے سے بھی نہیں نکلتے۔ اگر بندہ کوشش کرے کہ

میں آنکھوں کو نچوڑ لوں تو پھر بھی نہیں نکلتے۔ ہاں! وہی بندہ اگر سچی توبہ کر لے اور گناہوں کی وہ ظلمت ختم ہو جائے تو خود بخود آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

⊙...... پھر دوسرا سبب بیان کرتے ہیں:

مَنْ اَكْثَرَ لِلّٰهِ الصِّدْقَ نَدِيَتْ عَيْنَاهُ

''جو دل میں نیت کا سچا ہو اس کی بھی آنکھیں بہہ پڑتی ہیں۔''

جو بندہ نیت کا سچا ہو، یعنی اس کی نیت خالص ہو تو اس کی وجہ سے بھی اس کو رونا آجاتا ہے۔

⊙...... تیسرا سبب کیا ہے؟ فرمایا:

اِذَا قَرِحَ الْقَلْبُ نَدِيَتْ عَيْنَانِ

''جب دل مغموم ہوتا ہے تو پھر آنکھوں سے خود بخود آنسو آ جاتے ہیں۔''

تو آخرت کے غم کو اپنے دلوں پر سوار کر لیجیے، تاکہ اسی دنیا میں ہماری آنکھوں سے آنسو نکلیں اور ہماری خطائیں ادھر ہی صاف ہو جائیں۔ جی ہاں! یہ خطائیں بھی ڈیلیٹ ہو جاتی ہیں۔ ایک ایک آنسو پچھلے سب گناہوں کو ڈیلیٹ کر دیتا ہے۔

رونے کے بارے میں علما کے اقوال:

اب اس سلسلے میں علما کے اقوال بھی سن لیجیے۔

⊙...... حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ يَبْكِيَ فَلْيَبْكِ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَلْيَتَبَاكِ

''تم میں سے جو رو سکتا ہے وہ روئے اور جو رو نہیں سکتا وہ رونے والی صورت بنالے''

ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اس بہروپ کو ہی قبول فرمالیں۔ اللہ کو رونا اتنا پسند تو ہے نا۔

⊙......ابن عمر رضی اللہ عنہ قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ جب وہ اس آیت پر پہنچے:

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (المطففین:٦)

''وہ دن جب انسان جہانوں کے پروردگار کے سامنے کھڑے ہوں گے۔''

تو رونے لگ گئے۔ حتی کہ غش کھا کر گر گئے اور ان کی قرات وہیں پر موقوف ہو گئی اور آگے قرآن پڑھ ہی نہ سکے۔

⊙......حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ایک غلام کا نام ''ہانی'' تھا۔ اس نے دیکھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جنت اور جہنم کے تذکرے سے اتنا نہیں روتے تھے لیکن قبر کو دیکھ کر بہت روتے تھے۔ اس بات کو وہی غلام بیان کرتے ہیں:

''عثمان جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تھے تو رونا شروع کر دیتے حتی کہ اپنی داڑھی کو پکڑ لیتے تھے۔ ان سے پوچھا گیا: جب آپ کے سامنے جنت اور جہنم کا تذکرہ ہوتا ہے تو آپ نہیں روتے اور قبر کو دیکھ کر رونے لگ جاتے ہیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے، اگر قبر کا معاملہ آسان ہوگا تو اس کے بعد آنے والا معاملہ اور بھی آسان ہوگا اور اگر قبر سے نجات نہ ملی تو اس کے بعد آنے والا معاملہ اور بھی سخت ہوگا۔ عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے یہ فرمایا: میں نے قبر سے زیادہ مشکل اور فضیحت والا کوئی دوسرا منظر نہیں دیکھا۔''

کتنے لوگ ایسے ہوں گے کہ جو قبر میں جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی گت بنائیں گے۔

⊙......ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

لِيَسْعَكَ بَيْتَكَ وَابْكِ مِنْ ذِكْرِ خَطِيْئَتِكَ وَكُفَّ لِسَانَكَ

''گھر میں رہو، اپنی خطاؤں کو یاد کر کے روؤ اور اپنی زبان کو بند رکھو۔''

⊙......ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ محدث ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

عَوِّدُوْا اَعْیُنَکُمُ الْبُکَاءَ وَ قُلُوْبَکُمُ التَّفَکُّرَ

''اپنی آنکھوں کو رونے کا عادی بناؤ اور دلوں کو سوچنے کا عادی بناؤ۔''

علاماتِ محزون:

سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس بندے کے دل پر غم طاری ہوتا ہے اور وہ محزون ہوتا ہے اس کی کچھ علامات ہیں۔ فرماتے ہیں:

(۱)......اَلْحُزْنُ اللَّازِمُ۔ اس کے دل کے اوپر حزن غالب ہوتا ہے۔

(۲)......اَلْھَمَّ الْغَالِبُ۔ اس کے اوپر غم غالب ہوتا ہے۔

(۳)......اَلْخَشْیَۃَ الْمُقْلِقَۃُ۔ ایسی خشیت ہوتی ہے جو اس کے دل کو بے قرار رکھتی ہے۔

(۴)......کَثْرَۃُ الْبُکَاءِ۔ وہ کثرت کے ساتھ روتا ہے۔

(۵)......اَلتَّضَرُّعَ فِی اللَّیْلِ وَ النَّھَارِ۔ دن اور رات کے اندر وہ اللہ کے حضور گڑگڑاتا ہے۔

(۶)......اَلْھَرْبُ مِنْ مَوَاطِنِ الرَّاحَۃِ۔ راحت کے مقامات سے وہ اپنے آپ کو دور رکھتا ہے۔

(۷)......وَوَجَلَ الْقَلْبِ۔ اور اس کا دل ہر وقت گڑگڑاتا رہتا ہے۔

کیوں؟ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کو جانتا ہے۔

ایک ہی جملے میں نوجوان کی اصلاح:

یہی سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

میں نے ایک دفعہ وعظ کیا اور اس میں میں نے ایک فقرہ بولا:

عَجَباً لِضَعِیفٍ یَعْصِیْ قَوِیًّا

''تعجب ہے اس کمزور پر جو قوی کی نافرمانی کرتا ہے۔''

کہتے ہیں کہ یہ سن کر ایک نوجوان کھڑا ہو گیا۔ اس کا لباس بڑا فاخرانہ اور امیرانہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھ حشم وخدام بھی تھے۔ وہ اٹھا اور چلا گیا۔

اگلے دن میں بیٹھا تھا کہ وہ میرے پاس اکیلا آیا۔ اس دن اس کے نوکر چاکر نہیں تھے۔ سادہ سا سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے آ کر پوچھنے لگا: کل آپ نے ایک بات کہی تھی۔ میں نے کہا: ہاں۔ پوچھنے لگا: اس کا معنیٰ کیا ہے؟ میں نے کہا: دیکھو! اللہ سے قوی کوئی ہے نہیں اور بندے سے ضعیف بھی کوئی نہیں۔ لہٰذا تعجب ہے اس بندے پر جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس نافرمانی پر سزا دینے کا فیصلہ فرمالیں تو بندے کا کیا بنے گا۔

فرماتے ہیں کہ جب اس نے میری بات سنی تو اس کی آنکھوں میں سے آنسو آ گئے اور کہنے لگا: آج کے بعد میں اپنی زندگی کا رخ بدلتا ہوں اور میں اپنے اس قوی پروردگار کی کبھی نافرمانی نہیں کروں گا۔

پروردگارِ عالم کا شکوہ......!!!

عطا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''میرے بندوں سے کہہ دو کہ تم ان تمام دروازوں کو بند کر لیتے ہو جس سے مخلوق دیکھتی ہے اور اس دروازے کو بند نہیں کرتے جس سے میں پروردگار دیکھتا ہوں۔ کیا اپنی طرف دیکھنے والوں میں سب سے کم درجے کا تم مجھے سمجھتے ہو؟''

اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی خطاؤں پر نظر رکھیں اور قیامت کے دن کو سوچا کریں جس میں سے ابھی ہمیں گزرنا ہے۔ پھر بات سمجھ میں آ جائے گی کہ ہمارے

اکابر کیوں اتنا رویا کرتے تھے؟ اخلاق الصالحین میں لکھا ہے: ہمارے بعض بزرگ راتوں کو اتنا روتے تھے کہ جس جگہ پران کے آنسو گرتے تھے اس جگہ پر گھاس اگ آیا کرتی تھی۔ اللہ اکبر!

رونے کا ایک عجیب سبب:

ایک آدمی بہت روتا تھا۔ اس سے پوچھا: بھئی! تم اتنا کیوں روتے ہو؟ تو وہ کہنے لگا:

''مجھے یہ بات سوچ کر رونا آتا ہے کہ میں نے جب گناہ کیا تو میں نے اپنے گناہ پر گواہ اس پروردگار کو بنایا جو مجھے سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے۔ اللہ نے سزا کو قیامت کے دن تک مؤخر کر دیا اور مجھے قیامت تک مہلت دے دی کہ تم نے اگر رو دھو کے منانا ہو تو منا لو۔ اللہ کی قسم! اگر مجھے اختیار دیا جائے کہ دو باتوں میں سے تو کس بات کو اختیار کرتا ہے، ساری مخلوق کے سامنے تیرا حساب کریں اور پھر تجھے جنت میں بھیج دیں یا تجھے کہا جائے کہ تو مٹی ہو جا، تو میں قیامت کے دن مٹی بن جانے کو اختیار کروں گا۔''

یعنی میں نہیں چاہوں گا کہ میرا نامۂ اعمال ساری مخلوق کے سامنے کھولا جائے۔

اب اس بات کو آپ ذرا یوں سوچیے کہ اگر قیامت کے دن

...... باپ کا نامہ اعمال اولاد کے سامنے کھولا جائے

...... ماں کا نامہ اعمال بچوں کے سامنے کھولا جائے

...... شاگرد کا نامہ اعمال استاد کے سامنے کھولا جائے

...... پیر کا نامہ اعمال مریدوں کے سامنے کھولا جائے

...... بڑوں کا نامہ اعمال چھوٹوں کے سامنے کھولا جائے

تو کیا قیامت کے دن ہم اس بات پر آمادہ ہو جائیں گے کہ سب کے سامنے

حساب کھولا جائے؟ دل کیا کہے گا؟ بیوی کبھی برداشت نہیں کرے گی کہ میرا نامۂ اعمال میرے خاوند کے سامنے کھولا جائے۔ وہ کہے گی: یا اللہ! میں خود ہی جہنم میں چلی جاتی ہوں، میرا نامۂ اعمال نہ کھولنا، کیونکہ میں ذلت برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر ہم واقعی اس دن کی ذلت برداشت نہیں کر سکتے تو پھر آج وقت ہے، اپنی خطاؤں پر نادم و شرمندہ ہو کر اللہ کے حضور روئیں اور ان خطاؤں کو اپنے نامۂ اعمال سے بخشوا کر مٹوا لیں۔ آج یہ گناہ آسانی کے ساتھ ڈیلیٹ ہو سکتے ہیں مگر اس کے لیے اس میں احساس ندامت کا ہونا ضروری ہے۔

دل ہلا دینے والی ایک روایت:

قیامت کے دن ذلت و رسوائی کیسے ہوگی؟ اس سلسلے میں بھی ذرا حدیث مبارکہ سن لیجیے۔ اس حدیث پاک کو ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ جیسے محقق عالم نے بھی بیان کیا۔ وہ روایت حدیث کے معاملے میں بڑے محتاط ہیں۔ تو انہوں نے اپنی کتاب میں یہ بات لکھی ہے۔ ذرا توجہ سے سنیے گا:

> ''نبی علیہ السلام فرماتے ہیں: مجھے جبرئیل علیہ السلام نے قیامت کے دن کی ہولنا کیوں سے اتنا ڈرایا، اتنا ڈرایا، اتنا ڈرایا کہ میں رونے لگ گیا۔ میں نے کہا: اے میرے دوست جبرئیل: کیا اللہ رب العزت نے میرے اگلے اور پچھلے گناہوں کو معاف نہیں کر دیا؟ یہ بات سن کر جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! قیامت کے دن آپ ہیبت کے ایسے احوال دیکھیں گے کہ آپ قیامت کی مغفرت کو بھول جائیں گے۔ نبی علیہ السلام یہ بات سن کر اتنا روئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو آپ کی مبارک ریش پر بہنے لگے۔''

اللہ اکبر!

یہ اللہ کے حبیب ﷺ کا معاملہ ہے۔

اللہ کی خفیہ تدبیر سے بچنے کی اتنی فکر......!!!

طہارت القلوب میں یہ بات لکھی ہے:

لَمَّا مَكَرَ بِاِبْلِيسَ لَعَنَهُ اللّٰهُ طَفِقَ جِبْرَائِيلَ وَ مِيكَائِيلَ يَبْكِيَانِ

''جب ابلیس لعنت اللہ کو اللہ نے اپنے دربار سے دھتکار دیا تو جبرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام نے رونا شروع کر دیا۔''

دھتکارا تو ابلیس کو جا رہا ہے اور رونا انہوں نے شروع کر دیا۔

فَاَوْحَى اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَيْهِمَا مَا لَكُمَا تَبْكِيَانِ

''اللہ تعالیٰ نے ان سے پوچھا: تم دونوں کیوں روتے ہو؟''

قَالَا : يَارَبِّ مَانَاَ مَنُ مَكْرُكَ

''دونوں نے کہا: اے اللہ! ہم آپ کی اس خفیہ تدبیر سے امن میں نہیں ہیں''

یعنی اس ابلیس نے بھی تو ہزاروں سال عبادت کی تھی نا اور ہزاروں سال کی عبادت کرنے کے بعد پھر کیا تدبیر ظاہر ہوئی کہ اس کو دھتکار دیا گیا، لہٰذا اے اللہ! ہم بھی آپ کی خفیہ تدبیر سے امن میں نہیں ہیں۔ جب انہوں نے یہ کہا تو

فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰكَذَا كُوْنَا لَا تَاْمَنَا مَكْرِىْ

''اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ایسے ہی ہونا چاہیے، تمہیں میری تدبیر سے کبھی امن میں نہیں ہونا چاہیے۔''

یعنی تمہارے اوپر میرا خوف رہنا چاہیے۔ میں جب چاہوں، جس کا حشر جیسا چاہوں کر دوں۔ میرے دوستو! اگر ان کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو ہم کیا چیز ہیں؟ ہماری کیا حیثیت ہے؟

جبرئیل علیہ السلام کا اضطراب:

ایک دفعہ جبرائیل علیہ السلام نبی علیہ السلام سے ملنے کے لیے آئے۔اس وقت جبرائیل علیہ السلام کانپ رہے تھے۔رو رہے تھے۔غلافِ کعبہ کے پاس گئے اور پھر اسے پکڑ کر انہوں نے دعا مانگی:

اِلٰهِیْ وَ سَیِّدِیْ لَاتُغَیِّرْ اِسْمِیْ وَ لَا تُبَدِّلْ جِسْمِیْ

''میرے اللہ! میرے سردار! میرے نام کو نہ بدلنا اور میرے جسم کو نہ بدلنا''

نبی علیہ السلام نے پوچھا: جبرئیل! آج آپ نے یہ کیا دعا مانگی؟ جواب میں جبرائیل علیہ السلام کہنے لگے:

''اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! جب سے ہم نے شیطان کو دھتکارے ہوئے دیکھا ہے اس وقت سے دل پر اللہ تعالیٰ کا ایسا خوف ہے کہ میں یہ دعا مانگتا ہوں: اے اللہ! شیطان کا نام عزازیل تھا اور آج اسے ابلیس کہتے ہیں، اے اللہ! تو نے اس کا نام بدل دیا۔پھر اسے اطاعت اور فرمانبردار لوگوں کے زمرے سے نکال کر اسے نافرمانوں کے زمرے میں شامل کر دیا۔(لہٰذا اب میں یہ دعا مانگتا ہوں کہ) اے اللہ! میرا نام نہ بدلنا اور میرے جسم کو فرمانبرداروں کے زمرے سے نکال کر کہیں نافرمانوں میں شامل نہ کر دینا۔''

ہم بھی اللہ رب العزت سے دعا مانگیں: اے کریم آقا! آپ کا در پکڑا ہے، آپ مہربانی فرما دیجیے، ہماری حاضری کو قبول کر لیجیے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اضطراب:

یہ وہ غم تھا جو صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی ہر وقت لگا رہتا تھا۔مثال کے طور پر ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جن کو نبی علیہ السلام کی مبارک زبان سے جنت میں بیوی

ہونے کی خوشخبری مل چکی تھی، وہ رات کو تہجد پڑھتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچتی تھیں:

﴿وَ بَدَالَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مَالَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ﴾ (الزمر: ۴۷)

''اوران کو اللہ کی طرف سے ایسا معاملہ پیش آئے گا جس کا وہ گمان بھی نہیں کرتے ہوں گے۔''

تو اس آیت پر رویا کرتی تھیں۔ ساری ساری رات یہ آیت پڑھتی رہتی تھیں۔ ذرا ہم بھی سوچیں کہ جو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا، اگر ہمارے ساتھ قیامت کے دن ایسا معاملہ پیش آ گیا تو پھر ہمارا کیا بنے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضطراب:

صحابہ رضی اللہ عنہم جب قرآن پڑھتے تھے تو جو آیتیں کفار کے بارے میں ہوتی تھیں وہ اپنے اوپر چسپاں کر کے رویا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک آیت پڑھی گئی۔

﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾

(الاحقاف: ۲۰)

یہ آیت اگرچہ کفار کے بارے میں ہے، لیکن اسے سن کر عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کسی نے پوچھا: امیر المومنین! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ فرمایا:

''کیا پتہ! کل کہیں عمر کو بھی یہی نہ کہہ دیا جائے!!!''

قیامت کے دن انسانوں کی اسکیننگ:

کل قیامت کا دن ہوگا۔ ہمارے سر پر گناہوں کے انبار ہوں گے۔ وہاں اللہ

کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا۔ ایک ایک کو اللہ تعالیٰ دیکھیں گے۔ جیسے ایئرپورٹ پر ایک ایک کو مشین کے ذریعہ سے اسکین کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح ایک ایک بندے کے دل کو اسکین کریں گے۔ کتنے خوش نصیب ہوگے جو وہاں سے بحفاظت گزر جائیں گے اور ان کو جنت کا دروازہ دکھا دیا جائے گا۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہوں گے جو گزرنے لگیں گے تو ان کے بارے میں کہہ دیا جائے گا:

﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ﴾ (الصفت:۲۴)

''ان کو روک لیجیے، ہم نے ان کا ٹرائل لینا ہے''

یہ صوفی صاحب ہیں، اوپر سے تسبیح، اندر سے میاں کیسی

﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ﴾

''انہیں روک لیجیے، ہم نے ان کی تفتیش کرنی ہے۔''

سوچیے اگر یہی حکم ہمارے بارے میں ہوگیا تو ہمارا کیا بنے گا؟ کہیں گے:

......ان حاجی صاحب کو بھی روک لو،

......اس طالب علم کو بھی روک لو،

......اس عالم کو بھی روک لو،

شکل کیا بنائی ہوئی تھی، اصل کچھ اور تھا، آج دورنگی سامنے آگئی، ہماری مشین نے ان کے دل کو اسکین کرلیا۔

......ان کے دل میں محبت نہیں

......ان کے دل پر شہوت غالب رہتی تھی

......شیطانیت غالب رہتی تھی

......گندے خیالات غالب رہتے تھے

روک لو ان کو، ہم ذرا ان سے پوچھیں گے، نعمتیں ہم نے دی تھیں، ہماری

عبادت میں دل نہیں لگتا تھا، تم کیسی زندگی گزار کے آئے۔

"وَقِفُوْهُمْ" "روک لو ان کو" اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْن "ہم نے ان سے سوال کرنا ہے"

میرے دوستو! آج وقت ہے۔ ہم آج اپنے گناہوں پر رولیں، تاکہ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔

ایک انوکھا سفارشی:

حدیث مبارکہ میں ہے...... ذمہ داری سے عرض کر رہا ہوں...... اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جب جہنمیوں کو جہنم میں ڈالیں گے تو کئی لوگوں کو تو شفاعت کی وجہ سے نکال لیا جائے گا۔ انبیا شفاعت کریں گے، علما کریں گے، شہدا کریں گے، جنتی کریں گے۔ حتی کہ کوئی شفاعت کرنے والا باقی نہیں رہے گا۔

ایک جہنمی ایسا ہوگا جس کی پلکوں کا بال اللہ کے حضور سفارش کرے گا۔ کہے گا: یا اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ دنیا میں آپ کی محبت میں اور آپ کے خوف کی وجہ سے ایک مرتبہ رویا تھا۔ اس رونے کی وجہ سے ایک چھوٹا سا آنسو نکلا تھا جس کی وجہ سے میں تر ہو گیا تھا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ بندہ تیرے ڈر کی وجہ سے رویا تھا۔ اللہ تعالیٰ جبرائیل علیہ السلام کو فرمائیں گے: جبرائیل! ندا دے دو کہ پلکوں کے ایک بال کی گواہی کی وجہ سے ہم نے اس جہنمی کو بھی جہنم سے نکال لیا۔

آج گناہوں پر رولیں:

میرے دوستو! جب قیامت کے دن یہ معاملہ ہوگا تو آج آسان کام ہے، ہم اللہ کے سامنے اپنے گناہوں پہ روئیں، اپنی خطاؤں پہ روئیں اور آئندہ سچی زندگی گزارنے کی دل میں نیت کر لیں۔ اسی لیے کسی نے کہا ؎

بَکَیْتُ عَلَی الذُّنُوْبِ لِعَظْمِ جُرْمِیْ
وَ حَقَّ لِکُلِّ مَنْ یَّعْصِی الْبُکَاءِ
فَلَوْ کَانَ الْبُکَاءُ یَرُدُّ هَمِّیْ
لَاَسْعَدَتِ الدُّمُوْعَ مَعًا دِمَاءُ

اللہ رب العزت ہمیں اپنی خطاؤں پر آنسو بہانے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ اس کو قبول بھی فرمالے۔ کہیں کل قیامت کے دن یہ ریا کے آنسو نہ بنا دیے جائیں۔ کہنے والے نے کیا ہی اچھی بات کہی:

جیہڑا لطف ہے رون اندر اوہ وچ بیان نہ آوے
رونا دل دی میل اتارے نالے رٹھڑے یار مناوے
یادِ خدا وچ رون والا کدی دوزخ وچ نہ جاوے

اللہ! ہم پر مہربانی فرمادے۔ ہم قیامت کے دن کی ذلت کو برداشت نہیں کر سکتے، دو بندوں کے سامنے کی ذلت ہم سے برداشت نہیں ہوتی، قیامت کے دن آپ کے حبیب ﷺ کے سامنے کی ذلت کیسے برداشت ہوگی۔ اے اللہ! ہماری ان خطاؤں کو معاف فرما دیجیے اور ہمیں بھی اپنے مقبول بندوں میں شامل فرما لیجیے۔ اللہ! ان دلوں کو بھی نرم بنا دیجیے تا کہ ان آنکھوں سے بھی ندامت کے آنسو بہنے آسان ہو جائیں۔ (آمین ثم آمین)

وَ آخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ



وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ اَمَلًا القرآن الحکیم

مال اور بیٹے رونق ہیں دُنیا کے جیتے ، اور رہنے والی نیکیوں پر بہتر ہے تیرے رب کے ہاں بدلہ ، اور بہتر ہے توقع

﴿ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴾

(الاحزاب: ۴۸)

یقینِ کامل کی اہمیت

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

اقتباس

انبیائے کرام نے انسانوں کو Definite (پکے) نتائج حاصل کرنے والی زندگی گزارنا سکھائی۔ یہ Diffrential Reasons (امکانی باتیں) نہیں ہیں پکی باتیں ہیں۔ جس نے انبیائے کرام کے راستے پر چل کر زندگی گزاری اس کو یقیناً اللہ کی جانب سے عزت مل کر رہتی ہے، اس میں شک والی بات نہیں ہے۔ اس کو بندے کا ایمان اور یقین کہتے ہیں۔ سو فیصد بندے کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ میں اب ہر حال میں اللہ کے حکم پر عمل کروں گا۔ میری آنکھ جو بھی دیکھتی پھرے اللہ رب العزت مجھے عزتیں عطا فرمائیں گے۔ اگر میں اللہ کے حکم سے ہٹ کر زندگی گزاروں گا تو میری نظر کتنے ہی کامیابی کے نقشے دیکھتی پھرے، میرے لیے اللہ بالآخر ذلت نکال دے گا۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

یقینِ کامل کی اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ـ وَ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا﴾ (الاحزاب:۴۱ـ۴۲)
﴿وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾ (الاحزاب:۴۸)
قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِى مَقَامٍ آخَرَ
﴿وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ (الطلاق:۳)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

سنتِ الٰہی اور قدرتِ الٰہی:

اللہ رب العزت نے اس کائنات کو اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرمایا اور اس کے چلنے کے کچھ اصول متعین فرما دیے۔جن اصول کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے۔ہم ان کو قوانینِ فطرت کہتے ہیں، Physical Laws کہتے ہیں۔عربی زبان میں اس کو اللہ رب العزت کی سنت کہتے ہیں۔یہ کائنات ان اصولوں کے تحت چلتی رہتی ہے۔لیکن جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو ان اصولوں سے ہٹ کر اپنی مرضی اور منشا کے مطابق چیزوں کو استعمال فرماتے ہیں،اس کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کہتے

ہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک آدمی نے فیکٹری لگائی اور اس کو چلانے کا ایک نظام ترتیب دے دیا، فیکٹری چل رہی ہے، روٹین کے مطابق نظام کام کر رہا ہے، اب وہ نظام بنا کر مجبور نہیں ہو گیا کہ کچھ کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔ وہ مالک ہے جب چاہے نظام کو اپنی مرضی اور منشا کے مطابق بدل سکتا ہے۔ تو گویا ایک اللہ رب العزت کی سنت ہوئی، یہ وہ قانون ہے جس میں عام دستور کے مطابق دنیا چل رہی ہے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾

عام حالات میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بدلتی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آگ جلاتی ہے، پانی سطح کو برابر کرتا ہے۔ یہ اللہ رب العزت کے اصول ہیں، لیکن اگر اللہ رب العزت چاہیں تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا اور آگ نے انہیں جلایا نہیں اور ایسا بھی ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم دریا کے کنارے پہنچ گئی اور پانی نے اپنی سطح برابر کرنے کی بجائے ان کو راستہ دے دیا۔ تو یہ اللہ رب العزت کی قدرت ہے، وہ مالک الملک ہے، اس نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ اس کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز ہے، وہ جیسے چاہے چیزوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ یہ اللہ کی قدر ہے۔

اسباب اور مسبب الاسباب پر نظر رکھنے والے:

اب یہاں سے مومن کی زندگی اور کافر کی زندگی میں فرق ہے۔ کافر کائنات کو ان کے اصولوں کے مطابق چلتا ہوا دیکھ کر یہی سمجھتا ہے کہ بس انہی اصولوں کے مطابق ہی کائنات نے چلنا ہے جبکہ مومن کی نظر اللہ رب العزت کی ذات پر ہوتی ہے تو وہ جانتا ہے کہ اللہ رب العزت قادرِ مطلق ہیں، ہوگا وہی جو میرے اللہ رب العزت کی مرضی اور منشا ہوگی۔ تو مومن کی نظر مسبب الاسباب پر ہوتی ہے اور کافر کی نظر فقط

اسباب پر ہوتی ہے۔اس لیے کافر دنیا میں دھوکہ کھا جاتا ہے اور مومن ہمیشہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت اللہ رب العزت نے اپنے انبیا پر کھولی اور انہوں نے آ کر لوگوں کو یہ بات سمجھائی کہ لوگو! جو تمہاری ظاہر کی نظر دیکھ رہی ہے ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا، جب اللہ رب العزت چاہیں گے تمہاری نظر تمہیں دھوکہ دے جائے گی۔ تمہارے سینکڑوں سالوں کے تجربات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے، اللہ کی منشا پوری ہو جائے گی۔اب اس کی ایک مثال سمجھیے۔

جب کوئی آدمی ایمرجنسی کی حالت میں ہسپتال لایا جاتا ہے تو ڈاکٹر اس کو ایک نظر دیکھ لیتے ہیں اور اس کی بیماری کی چند وجوہات لکھ دیتے ہیں اس کو Differntial Reasons (امکانی وجوہات) کہتے ہیں۔اس مریض کی یہ حالت ہے تو یہ بھی ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے، تو جتنے امکان ہو سکتے ہیں ان کو Differential Reasons کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد اس کے ٹیسٹ لیے جاتے ہیں، اس کا بلڈ ٹیسٹ لیا جاتا ہے اور بھی ٹیسٹ لیے جاتے ہیں تو ٹیسٹ کے بعد متعین ہو جاتا ہے کہ بیماری کی یہ وجہ تھی۔اس کو Definite Reason کہتے ہیں۔ جو اسباب پر نظر رکھ کر زندگی گزارنے والے ہیں وہ Differential Reasons پر زندگی گزارتے پھر رہے ہیں اور مومن چونکہ اللہ رب العزت کے حکموں کو سامنے رکھ کر چلتا ہے، اس کے سامنے ہمیشہ Definite Reason ہوتی ہے۔

مثال سے بات سمجھ لیجیے کہ عام دستور کے مطابق جب آسمان پر بادل آ جائیں تو یہ بارش کی علامت ہوتی ہے کہ پہلے بادل آئے اور پھر بارش ہوئی لیکن یہ Differential Reasons ہیں۔ ہمیشہ تو ایسے نہیں ہوتا کبھی پورا مہینہ بادل آتے ہیں اور بارش کی بوند نہیں برستی ان کو Diffirential Reasons کہیں گے۔ ایک Definite Reason ہے بارش کے برسنے کی۔قرآن نے اس بات کو

کھولا کہ جب بھی کوئی قوم استغفار کرتی ہے اللہ کے سامنے تو ان کے استغفار کو قبول کر کے اللہ رب العزت بارشوں کو برسا دیتے ہیں۔

﴿اِسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا﴾ (نوح:۱۱)

اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب بارش نہ ہو تو سارے لوگ ایک میدان میں جمع ہوں اور اللہ کے سامنے اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو اللہ ان کی توبہ کو قبول کر کے بارش کو نازل فرما دیتے ہیں یہ Definite Reason ہے بارش کے برسنے کی۔

اسباب برتن کی مانند ہیں:

اسباب کی حیثیت تو ایسے ہے جیسے کوئی برتن ہوتا ہے، اس میں نفع ڈالنا یا نقصان ڈالنا اس کے مالک کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اب آپ کے پاس ایک گلاس ہے چاہیں تو اس میں پانی ڈالیں، چاہیں تو اس میں دودھ ڈالیں۔ بالکل! یہ تمام دنیا اسباب پر چل رہی ہے اور ان اسباب میں نفع ڈال دینا یا نقصان ڈال دینا یہ میرے مولا کی منشا کے مطابق ہوتا ہے۔

ذلت کے نقشوں میں عزت کا فیصلہ:

جو بندہ اپنے رب کو راضی کرتا ہے اللہ رب العزت اس کو ذلت کے نقشوں میں بھی عزت عطا فرما دیتے ہیں جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے غلامی کے نقشے سے نکال کر بادشاہی عطا فرما دی۔

عزت کے نقشوں میں ذلت کا فیصلہ:

اور جب کوئی بندہ اللہ کے حکموں کے خلاف زندگی گزارتا ہے اللہ رب العزت

اس کے لیے عزت کے نقشوں میں سے ذلت نکال دیتے ہیں۔ قارون کو کیا عزت ملی تھی! اپنے وقت کا کتنا بڑا بزنس مین تھا؟ کہا کرتا تھا کہ یہ

﴿اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ﴾ (القصص:۷۸)

جو میرے پاس علم ہے، ٹیکنالوجی ہے، جتنا میرا تجربہ ہے۔ میں بزنس مین ہوں، میں اچھی ڈیل کرتا ہوں، تب پیسے آتے ہیں۔

﴿فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ﴾ (القصص:۷۹)

قوم کے سامنے بڑے زیب و زینت سے نکلتا تھا۔ لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں کہتے تھے۔

﴿یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ﴾ (القصص:۷۹)

اے کاش! ہمارے پاس بھی اتنا ہوتا جتنا قارون کو ملا۔

اپنے وقت میں وہ رول ماڈل تھا لوگوں کے لیے۔ اس کی عزت کے نقشوں میں اللہ نے اس کے لیے ذلت ایسے نکالی

﴿فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ﴾ (القصص:۸۱)

اس کو اور اس کے خزانوں کو ہر چیز سمیت زمین میں دھنسا دیا۔

دودھ سے صحت بھی، موت بھی:

آپ غور کریں! ایک بندہ دودھ پیتا ہے تو اس کی صحت اچھی ہوتی ہے اور وہ قوی ہو جاتا ہے۔ اور ایک بندہ دودھ پیتا ہے اور فوڈ پوائزننگ ہونے کے بعد دودھ پینے کی وجہ سے اس کی موت آ جاتی ہے۔ جب اللہ چاہیں دودھ زندگی بخشتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ چاہیں، یہ دودھ انسان کو موت دے دیتا ہے۔ یہ بات اگر کھل جائے تو زندگی آسان ہو جائے۔

شفا اللہ کے حکم سے ملتی ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام بیمار ہوئے، کوہِ طور پر آئے اور پوچھا: پروردگارِ عالم! طبیعت ناساز ہے۔ حکم ہوا: فلاں درخت کے پتے کھالو۔ استعمال کیے تو ٹھیک ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد پھر اسی طرح بیماری کے آثار ظاہر ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لے گئے اور درخت کے پتے بھی کھائے اور اثر بھی نہیں ہوا۔ اب کوہ طور پر گئے کہ ربِ کریم! آپ ہی کے حکم سے میں نے پتے کھائے تو شفا ملی تھی اب پتے بھی استعمال کیے ہیں مگر طبیعت ٹھیک نہیں ہو رہی۔ فرمایا: پیارے کلیم! ان پتوں میں شفا نہیں تھی ہم نے ان پتوں میں آپ کے لیے شفا رکھ دی۔ تھی تو یہ اللہ رب العزت کی مرضی اور منشا ہے کہ وہ جب چاہتے ہیں چیزوں میں انسانوں کے لیے فائدہ رکھ دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں انسانوں کے لیے نقصان رکھ دیتے ہیں۔

انبیا کا راستہ عزت کا راستہ:

انبیائے کرام نے انسانوں کو Definite (پکے) نتائج حاصل کرنے والی زندگی گزارنا سکھائی۔ یہ Diffrential Reasons (امکانی باتیں) نہیں ہیں پکی باتیں ہیں۔ جس نے انبیائے کرام کے راستے پر چل کر زندگی گزاری اس کو یقیناً اللہ کی جانب سے عزت مل کر رہتی ہے، اس میں شک والی بات نہیں ہے۔ اس کو بندے کا ایمان اور یقین کہتے ہیں۔ سو فیصد بندے کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ میں اب ہر حال میں اللہ کے حکم پر عمل کروں گا۔ میری آنکھ جو بھی دیکھتی پھرے اللہ رب العزت مجھے عزتیں عطا فرمائیں گے۔ اگر میں اللہ کے حکم سے ہٹ کر زندگی گزاروں گا تو میری نظر کتنے ہی کامیابی کے نقشے دیکھتی پھرے، میرے لیے اللہ بالآخر ذلت نکال دے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یقین:

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے یقین کو اتنا مضبوط کر لیا تھا کہ آنکھ کے دیکھنے سے اتنا یقین نہیں ہوتا تھا جتنا اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے فرما دینے سے ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت ہے جو مدینہ کی خبر مکہ والوں کے پاس لے کر جا رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ جاؤ اور اس سے وہ رقعہ لے آؤ۔ انھوں نے اس کو راستے میں جا پکڑا، کپڑوں کی تلاشی لی، کچھ نہیں نکلا۔ لوگ حیران تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں میرے آقا کا فرمان ہے۔ اس عورت سے کہا کہ تم رقعہ دے دو! ورنہ تیرے کپڑے اتار کر تیرے پوشیدہ حصوں کے اندر سے بھی ہمیں رقعہ نکالنا پڑا تو ہم نکالیں گے۔ جب اس عورت نے یہ الفاظ سنے تو وہ ڈر گئی اور اس نے رقعہ اپنے بدن کے چھپے ہوئے حصے سے نکال کر دیا۔ اس کو یقین کہتے ہیں کہ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے بات نکلی تو ان کو پکا یقین تھا کہ Definite (پکی) بات ہے۔ اب ہمیں بھی یقین ہو جائے کہ ہم بھی نبی علیہ السلام کی سنتوں والی زندگی گزاریں گے تو Definite کامیاب ہو جائیں گے۔

شریعت کے حکم میں نفع ہی نفع:

یہ پکی بات ہے کہ اسباب کی دنیا میں رہتے ہوئے انسان چونکہ ہر چیز آنکھ سے دیکھ رہا ہوتا ہے تو اس کی نظر چیزوں کی طرف چلی جاتی ہے، مسبب الاسباب سے توجہ ہٹ کر اسباب پر جم جاتی ہے۔ اب اس کو نظر آتا ہے کہ مجھ کو سود ملے گا تو میرے پاس نفع آئے گا، مگر شریعت نے کیا کہا کہ یہ نفع کا آنا نہیں ہے بلکہ تمہارے مال میں سے برکت کا نکلنا ہے، جو تمہیں آتا ہوا نظر آتا ہے وہ تھوڑا ہے اور جو اس سے چلا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ ہے۔ اور ہم نے دیکھا کہ سود کا کاروبار کرنے والے پورے کا

پورا اپنا کاروبار ڈبو بیٹھتے ہیں۔ہم نے درجنوں بندوں کو سودی کاروبار میں ڈوبتے ہوئے دیکھا۔

تو ایک ہوا نظر کا راستہ اور ایک ہوا خبر کا راستہ۔نظر کا راستہ تو یہ ہے کہ جو عام روٹین میں ہوتا نظر آتا ہے، بندہ اس کے مطابق سوچ کر چلنے لگے۔

''چلو تم ادھر کو جدھر کی ہوا ہو''

مگر یہ تو کافر کی زندگی ہوتی ہے کہ جدھر فائدہ دیکھا ادھر لپک پڑے۔اس کے ذہن میں یہ تو نہیں ہوتا کہ میں نے اللہ کو راضی کرنا ہے۔مگر مومن کا معاملہ کچھ اور ہوتا ہے،وہ نبی کا بندہ نہیں ہوتا وہ خدا کا بندہ ہوتا ہے۔وہ اللہ رب العزت کے حکم پر چلتا ہے اور بالآخر اللہ رب العزت اس بندے کو ہمیشہ کے لیے کامیاب فرما دیتے ہیں۔

خوف،نبوت کے منافی نہیں:

چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ہم کلامی ہوئی تو ربِ کریم نے فرمایا:

﴿مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَا مُوْسٰى﴾ (طٰہٰ:۱۷)

''اے موسیٰ آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہے''

تو جواب دیا

﴿هِيَ عَصَايَ﴾ (طٰہٰ:۱۸)

''اے ربِ کریم!یہ میرا عصا ہے۔''

پھر اس کے فائدے بھی گنوا دیے۔

﴿اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا﴾

''میں اس سے ٹیک لگاتا ہوں''

﴿وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ﴾

''میں اپنے ریوڑ کو اس سے چراتا ہوں''

﴿وَلِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی﴾

''اے میرے مالک! اس میں میرے لیے بہت سے فائدے ہیں''

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلْقِهَا یٰمُوْسٰی﴾ (طٰہٰ:۱۹)

''اے موسیٰ! اس کو زمین پر ڈال دیجیے''

﴿فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی﴾ (طٰہٰ:۲۰)

''زمین پر ڈال دیا تو وہ دوڑنے والا اژدھا بن گیا''

جب اس کو دوڑتے ہوئے دیکھا تو

﴿فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی﴾ (طٰہٰ:۶۷)

''حضرت موسیٰ کے دل میں خوف پیدا ہو گیا''

اور یہ نبوت کے منصب کے خلاف نہیں ہوتا یہ ایک طبعی چیز ہے، جیسے بھوک لگنا، پیاس لگنا، نیند آنا یہ سب نبوت کے منافی نہیں، اسی طرح کسی چیز سے ظاہری طور پر خوف محسوس ہو جانا یہ فطری چیز ہے اور جب ان کو خوف محسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿خُذْهَا وَلَا تَخَفْ﴾ (طٰہٰ:۲۱)

''اے میرے پیارے کلیم اس کو پکڑ لیجیے اور ڈریے نہیں''

﴿سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی﴾ (طٰہٰ:۲۱)

''ہم اسے پہلے والی سیرت دے دیں گے۔''

چنانچہ جب اس کو دوبارہ پکڑا تو وہ دوبارہ عصا بن گیا۔ اب یہاں مقصد کوئی کرتب دکھانا نہیں۔ مقصد کیا تھا؟ مقصد ایک بات کا سمجھانا، تعلیم دینا تھا کہ اے

میرے پیارے کلیم! جس چیز کو آپ اتنا فائدے والا سمجھ رہے تھے اور اس کے اتنے فائدے گنوار ہے تھے، ہمارے حکم سے جب اس کو زمین پر ڈالا تو وہ نقصان والی چیز بن گئی اور جس کو نقصان والی چیز سمجھ کر گھبرا رہے تھے ہمارے حکم سے آپ نے اس کو ہاتھ لگایا تو وہ فائدے والی چیز بن گئی۔ تو ایک بات سمجھادی کہ نفع، نقصان چیزوں میں نہیں ہمارے حکم سے چیزوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔

یہی مومن کی حالت ہوتی ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اللہ رب العزت کی ذات پر جمی رہتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ رب العزت جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتے ہیں چیزوں کے بغیر اور چیزیں کچھ نہیں کر سکتیں اللہ کے بغیر۔ حقیقت میں یہ دل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ جب نظر اللہ کی ذات سے ہٹی وہیں دھوکہ کھایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اللہ پر یقین:

صحابہ رضی اللہ عنہم کا یقین ایسا تھا کہ نظر ہر وقت اللہ رب العزت کی ذات پر ہوتی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ فتوحات دے رہے ہیں۔ اتنی فتوحات کہ جدھر جاتے ہیں کامیابی قدم چومتی ہے، جدھر جاتے ہیں انہیں نئے انداز میں کامیابی مل جاتی ہے۔ جب ان کا طوطی بولتا تھا، عین اس زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک صحابی کو بھیجا اور پیغام دیا کہ خالد! آج جو رقعہ لے کر آرہا ہے آج کے بعد یہ فوج کا سپہ سالار ہوگا۔ اگر آپ اللہ کے راستے میں لڑنا چاہیں تو عام سپاہی بن کر لڑ سکتے ہیں اور واپس آنا چاہیں تو آپ میرے پاس مدینہ میں آجائیں۔ تو انہوں نے آکر رقعہ دیا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں! میں اللہ کے راستے میں جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سپہ سالار اور میں ایک عام سپاہی۔

کسی نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے پوچھا: حضرت! آپ فوج کے سپہ سالار تھے

اور بغیر کسی خاص وجہ کے امیر المومنین نے آپ کو ایک رقعہ بھیجا اور آپ عام سپاہی بن کر لڑنے لگے، آپ کو ایسا کرنا مشکل نہیں لگا؟ تو انہوں نے کہا کہ مجھے تو کچھ مشکل نہیں لگا، اس لیے کہ جب میں سپہ سالار بن کر لڑا تو جس ذات کو راضی کرنے کے لیے یہ عمل کر رہا تھا جب میں سپاہی بن کر لڑا تب بھی اس ذات کو راضی کرنے کے لیے عمل کیا، مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑا۔

کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اے امیر المومنین! آپ نے اس عمل سے امت کو اتنے بڑے جرنیل سے کیوں محروم کر دیا؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے امت کو جرنیل سے تو محروم کر دیا مگر میں نے امت کا ایمان بچا لیا۔ حضرت! وہ کیسے؟ فرمایا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ اتنی فتوحات دے رہے تھے کہ عام فوجیوں کے دل میں یہ بات آ رہی تھی کہ خالد جدھر جائے گا کامیابی ہوگی۔ لوگوں کی نگاہیں اللہ کی مدد سے ہٹ کر ایک ذات پر جم رہیں تھی تو میں نے کہا کہ وہ مدد ہٹ نہ جائے۔ میں نے ان کو ہٹا دیا، اللہ کی مدد تو اب بھی آئے گی اور اللہ اب بھی کامیابی عطا فرمائیں گے۔ آج ہماری بھی نظر ہر حال میں اللہ کی ذات پر رہے اس کو یقینِ کامل کہتے ہیں۔

بدر میں صحابہ کی مدد و نصرت:

اس لیے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو میدانِ بدر میں بالکل بے اسباب لے کر آیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مدینے میں رہنے والے گھروں سے باہر نکلیں اور ان کے پاس تلواریں نہ ہوں۔ جس کلچر میں ہر بندے کے پاس تلوار ہوتی تھی اس میں یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ پورے لشکر میں دو تلواریں؟ اصل وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اس جماعت کو بغیر تیاری کے کافروں کے سامنے کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ دنیا کو دکھانا چاہتے تھے کہ اگر

اُدھر بھی تلواریں ہوتیں اور اِدھر بھی تلواریں ہوتیں تو دنیا کہتی کہ یہ اس لیے کامیاب ہوگئے کہ یہ زیادہ بہتر تلوار چلانے والے تھے، یہ تھوڑے ہوکر بھی غالب آگئے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا معاملہ بنایا کہ اسباب تھے ہی نہیں اور ادھر لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج تھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا کیا حال تھا؟ قرآن نے خود گواہی دی:

﴿كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ﴾ (الانفال:٦)

صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب، کافروں کو لوہے میں ڈوبے ہوئے دیکھا تو یوں لگتا تھا کہ موت کے منہ میں دھکیلا جارہا ہے اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

﴿لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ﴾ (الانفال:٢١)

اللہ تعالیٰ چاہتے تھے کہ حق کو حق ثابت کردیں اور باطل کو باطل ثابت کردیں۔ چنانچہ جب یہ بغیر اسباب والی جماعت ان کے ساتھ ٹکرائی تو اللہ نے اپنی مدد جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ ایسی نازل فرمائی کہ ان نہتے لوگوں کو بالآخر کامیابی نصیب ہوئی۔ ارشاد فرمایا:

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (البقرة:٢٤٩)

کتنی بار ایسا ہوا کہ ایک تھوڑی سی جماعت بڑی جماعت پر غالب آگئی۔ اب اس کا ترجمہ سمجھنے کے لیے اپنی زبان میں کریں تو یوں ہوگا: کتنی بار ایسا ہوا کہ اللہ نے چڑیوں سے باز مروا دیے۔

﴿وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ ''اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''

پروردگار جب چاہتا ہے چڑیوں سے باز مروا دیا کرتا ہے۔ یہ یقین کہلاتا ہے۔ جب یہ یقین دل میں آجائے گا تو اللہ کی مدد ساتھ آجائے گی۔ جب یہ یقین ساتھ نہیں ہوگا تو اللہ کی مدد نہیں ہوگی، پھر اسباب اسباب سے ٹکرائیں گے اور پھر جس کے پاس اسباب زیادہ ہوں گے وہ کامیاب ہوجائے گا۔ تو مومن کو یہ تعلیم دی کہ تم

زندگی کے میدان میں اگر صرف اسباب لے کر آؤ گے تو ہمیشہ نقصان اٹھاؤ گے۔ تم زندگی کے میدان میں یقین کو لے کر آؤ۔ یقین ایسی نعمت ہے کہ اس کے مقابلے میں کچھ نہیں ٹھہر سکتا۔ اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم فرمایا کرتے تھے:

تَعَلَّمْنَا الْإِيْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ

''پہلے ہم نے ایمان سیکھا پھر ہم نے قرآن سیکھا''

آج یہ ایمان ہمیں سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ہم سب لوگوں کی نظر آج اسباب پر ہے، الا ماشاء اللہ۔ اب تو یوں ہو گیا ہے کہ ہر بندہ کہتا ہے کہ میرا تو یقین بنا ہوا ہے۔ بھئی! ہم تو زبان سے باتیں کرتے ہیں، حالات پڑھتے ہیں تو اس وقت نظر آتا ہے کہ یقین کس کا بنا ہوا ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ کچھ باتیں کرتے ہیں اور کچھ بات نہیں کرتے اور جب موقع آتا ہے تو اس وقت تقریباً سب کے عمل ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ اگر سچے یقین والے صرف تین سو تیرہ اٹھ کر آ جائیں تو اللہ رب العزت دنیا کا جغرافیہ بدل کر رکھ دیں۔

حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

تیرے ہاتھ میں ہو قرآن اور تو دنیا میں ہو پریشان

تیرے ہاتھ میں ہو قرآن اور تو دنیا میں رہے ناکام

تیرے ہاتھ میں ہو قرآن اور تو دنیا میں رہے غلام

غلامی نفس کی ہو، شیطان کی ہو یا کسی انسان کی ہو، نا، نا، نا

ہمیں کہتا ہے، یہ قرآن، اے میرے ماننے والے مسلمان!

﴿اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ﴾ (العلق:۳)

''تو پڑھ قرآن، تیرا رب کرے گا تیرا اکرام''

''تیرا رب تجھے عزت و وقار دے گا، تیرے ظاہر اور باطن کو نکھار دے

گا''۔ چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ ایک ایسا ٹارگٹ تھا جس کو پورا کرنا صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی مشکل نظر آتا تھا۔ سب کہتے تھے کہ یہ تو نہیں ہوسکتا، یہ کام تو نہیں ہوسکتا۔ اللہ نے وہ کام بھی کروادیا۔

ناقابل تسخیر قلعوں کی تسخیر:

ایک قوم تھی جس نے بڑے بڑے قلعے بنائے ہوئے تھے۔ مجھے مدینہ کے قریب وہ قلعے دیکھنے کا موقع ملا۔ کم از کم ایک میٹر سے چوڑی ان کے گھروں کی دیواریں تھیں، وہ قلعے ناقابلِ تسخیر نظر آتے تھے۔ ان کی بنیادوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ واقعی اس زمانے کی ظاہری نظر کہتی ہوگی کہ وہ ناقابل تسخیر قلعے ہیں۔ اب صحابہ رضی اللہ عنہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کو فتح کرنا بہت مشکل ہے مگر جب میرے اللہ کی مرضی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ راستے نکال دیا کرتے ہیں۔ سنیے قرآن عظیم الشان! اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِىٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَاظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا﴾ (الحشر:۲)

''تمہیں گمان ہی نہیں تھا کہ تم ان کو یہاں سے نکال سکو گے''

وَ ظَنُّوْٓا اوران کا بھی یہی گمان تھا

﴿اَنَّهُمْ مَّا نِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (الحشر:۲)

''کہ اب یہ قلعے اللہ کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں گے''

کوئی ان کو فتح نہیں کرسکتا۔ واہ میرے مولا! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا﴾ (الحشر:۲)

''پھر اللہ ایسی طرف سے آیا جہاں سے ان یہود کو گمان بھی نہیں تھا''

ہوا کیا؟

﴿وَ قَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (الحشر:۲)

''اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان والوں کا رعب پیدا کر دیا''

لہٰذا وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ یہ مسلمان جہاں جاتے ہیں ان کو کامیابی نصیب ہوتی ہے، ہماری طرف رخ کر لیا تو ہماری عورتوں کا کیا بنے گا؟ مال کا کیا بنے گا؟ تو بھائی ان کے آنے سے پہلے ہی محفوظ مقام پر منتقل ہو جاؤ۔ چنانچہ انہوں نے اپنا سامان نکال کر گھروں کو خالی کرنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ﴾ (الحشر:۲)

''اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو خراب کرنے لگے''

﴿وَ أَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الحشر:۲)

''مومنین کو پتہ چلا تو انہوں نے بھاگنے میں مدد دی'' میرے مالک فرماتے ہیں:

﴿فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ﴾ (الحشر:۲)

''او آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو''

جب میں چاہتا ہوں تو ایسے نہتے لوگوں سے ایسے قلعے والوں کو بھی شکست دلوا کر رکھ دیتا ہوں۔ اس یقین کو ہمیں اپنی زندگی کے اندر پیدا کرنا ہے۔ اس پر محنت کرنی پڑے گی، یہ دو چار باتیں کرنے سے حاصل نہیں ہوتا یہ زندگی کی قربانیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ میں اور آپ دو منٹ بیٹھ کر بات کر لیں، کوئی وعظ سن لیں، خطبہ دے لیں دو چار دن سوچتے رہیں تو اس سے یہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی، یہ مشقتوں سے کمانا پڑتا ہے اور پھر جس کے دل میں یہ یقین آ جاتا ہے، اللہ رب العزت کی مدد اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ تو ایک ہوا نظر کا راستہ اور ایک ہوا خبر کا راستہ۔

خبر کے راستے میں کامیابی ہے:

خبر کے راستے میں یقینی کامیابی ہوتی ہے۔نظر کے راستے میں کامیابی ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی۔آپ غور فرمائیں،قرآن مجید کی چند مثالیں سن لیجیے:

☆......حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کے درمیان گھرے کھڑے ہیں۔انہوں نے اپنی رسیاں پھینکیں۔

﴿يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعٰى﴾ (طٰہٰ:٦٦)

''ان کے جادو کی وجہ سے ایسے محسوس ہوا جیسے یہ رسیاں سانپ بن کر چل رہی ہیں''

اب ایسے وقت میں انسان اپنی عقل سے پوچھے کہ کیا کرنا چاہیے؟ تو عقل کہتی ہے کہ ان سانپوں کے واسطے تمہارے پاس فقط لاٹھی ہے۔لہٰذا لاٹھی مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑنا،جو سانپ قریب آئے لاٹھی سے اس کو کچل دینا،خیال رہے لاٹھی چھوٹنے نہ پائے،کہیں ٹوٹنے نہ پائے،اس لیے کہ یہ امید کا آخری سہارا اور آخری کرن ہے،یہ ہے نظر کا راستہ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے پیغمبر ہیں،انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا کہ میرے مولا! آپ کا کیا حکم ہے؟ اوپر سے اطلاع آرہی ہے،خبر آرہی ہے:

﴿أَلْقِهَا يَا مُوسٰى﴾ (طٰہٰ:١٩)

اے موسیٰ! اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دو! عقل چیختی ہے،چلاتی ہے،شور مچاتی ہے،یہ کیا کررہے ہو،یہ زندگی کا آخری سہارا،اس کو بھی ہاتھ سے چھوڑ رہے ہو۔مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے،انہوں نے حکم خدا پر عمل کیا،ظاہری نظر کو نہیں دیکھا جیسے ہی اس کو پھینکا وہ اژدھا بن گیا اور اس نے تمام سانپوں کو کھالیا اور اللہ

نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کامیابی عطا فرمادی۔

⊙ ......حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر دریا کے کنارے کھڑے ہیں۔ پیچھے فرعون بھی اپنے لاؤ لشکر کو لے کر پہنچ گیا۔اب عجیب سی صورت حال ہے، آگے پانی کا دریا ہے اور پیچھے انسانوں کا دریا ہے۔

نا جائے بادن نہ پائے رستم

﴿قَالَ اَصْحٰبُ مُوسٰی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ﴾ (الشعرا:۶۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ نے کہا: اب ہم ٹریس ہو گئے اب کیا ہوسکتا تھا؟ اس وقت یقین بھری آواز اٹھی حضرت موسیٰ نے فرمایا: کَلَّا ''ہرگز نہیں''

﴿اِنَّ مَعِیَ رَبِّی سَیَھْدِیْنِ﴾ (الشعرا:۶۲)

''میرا رب میرے ساتھ ہے اور ضرور میری رہنمائی کرے گا۔''

اچھا! ایسے وقت میں عقل سے پوچھیں کہ کیا کرنا چاہیے کہ آگے پانی کا دریا اور پیچھے انسانوں کا دریا۔اب میں کیا کروں؟ عقل کہے گی: تمہارے ہاتھ میں سوائے لاٹھی کے کچھ نہیں، بھئی! لاٹھی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جب دشمن آئے تو ان کا مقابلہ کر لینا، ممکن ہے کہ تم بچ جاؤ، یہی صورت بنتی ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔اوپر سے اطلاع آتی ہے:

﴿اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ﴾ (الشعرا:۶۳)

''میرے پیارے موسیٰ! اس عصا کو پانی پر مارو''

یہ بات سن کر عقل چیختی ہے، چلاتی ہے، شور مچاتی ہے، کہتی ہے: یہ کوئی بات ہے بھلا کہ پانی پر لاٹھی مارو۔کیا بنے گا لاٹھی کو پانی پر مارنے سے؟ اوہ بھئی! مارنی ہے تو اس لاٹھی کو فرعون کے سر پر مارو، پھر تو شاید کچھ بن جائے، پانی پر مارنے سے کیا بنے گا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ اللہ رب العزت کے پیغمبر تھے اس لیے انہوں نے پانی پر

لاٹھی ماری۔ اللہ رب العزت نے بارہ راستے بنا کر بارہ قبیلوں کو وہاں سے گزار دیا۔ تو کامیابی خبر کے راستے پر ہوئی نظر کے راستے پر نہ ہوئی۔

⊙..... حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر وادی تیہ میں ہیں۔ پانی نہیں ہے۔ ناز کی پلی قوم تھی۔ شکوے بھی بڑے کرتی تھی اور بات بات کا بوجھ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ڈال دیتی تھی۔ عجیب قوم تھی۔ کہنے لگی: حضرت! پانی نہیں پینے کو، پانی چاہیے جینے کو۔ پانی چاہیے، کیا کریں؟ اب ایسے وقت میں عقل سے پوچھا جائے کہ کیا کرنا چاہیے تو عقل کہتی ہے: آپ کے پاس کوئی ہتھیار اور اوزار ہے نہیں، صرف لاٹھی ہے، تو ایسا کریں کہ لاٹھی سے کوئی گڑھا کھودیں، دھیان رکھنا کہ لاٹھی ٹوٹنے نہ پائے، لاٹھی ٹوٹ گئی تو گڑھا بھی نہیں کھدے گا اور نیچے سے پانی بھی نہیں نکلے گا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اللہ رب العزت کی طرف سے پیغام ملا:

﴿فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ (البقرۃ:۶۰)

''میرے پیارے پیغمبر! اس لاٹھی کو پتھر پر دے ماریں''

عقل چیختی ہے، چلاتی ہے، شور مچاتی ہے، کہتی ہے: یہ کوئی کرنے کی بات ہے؟ پتھر پر لاٹھی مارو گے تو لاٹھی ٹوٹے گی اور تم گڑھا بھی نہیں کھود سکو گے اور تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ظاہر کو نہیں دیکھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جیسے ہی پتھر پر لاٹھی ماری اللہ تعالیٰ نے پتھر سے پانی کے چشمے جاری فرما دیے۔ تو معلوم ہوا کہ کامیابی خبر کے راستے پر ملتی ہے، نظر کے راستے پر نہیں ملتی اور خبر کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے نبی جو لائحہ عمل اور طرزِ زندگی لے کر آئے اس پر چلنے میں کامیابی اور اس کے خلاف چلنے میں ناکامی ہے۔

اگر یہ یقین ہو تو ہم کبھی کوئی عمل سنت کے خلاف نہ کریں، ہم کبھی گناہوں کا ارتکاب نہ کریں۔ ہم کیوں اپنے مالک کی نافرمانی کریں گے؟ یہ جو ہماری زندگی

کی اونچ نیچ ہے یہ ہمارے یقین کی کمزوری کی وجہ سے ہے۔ جو اس عاجز نے عرض کیا کہ یہ یقین کوئی آسان کام نہیں ہے، تو اسی لیے اگر یقین ہوتا تو ہماری آنکھ خطا نہ کرتی۔ اب بتائیں کہ ہم میں سے کتنوں کی آنکھ خطا کرتی ہے۔ ادھر اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) نماز پڑھ کر جاتے ہیں اور وہاں جا کر نظر کسی اور چیز پر پڑی تو وہاں نفس کا حکم مانا یا خدا کا حکم مانا؟ اس لیے کہا کہ یقین نہیں بنا ہوا ہے۔

ایک تابعی کا یقین:

ایک تابعی تھے۔ وقت کے بادشاہ نے بیٹی کو کہا کہ ہم اس قیدی کو اپنا بنانا چاہتے ہیں، اس کو اپنے دین پر لاؤ۔ وہ ایک مہینہ یا کم وبیش اپنے آپ کو بنا سنوار کر ان کے پاس جاتی اور ان کا دل لبھانے کی کوشش کرتی، مگر انہوں نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ایک مہینے بعد پوچھنے لگی مجھ میں کیا کمی ہے؟ میں حسن و جمال کی پیکر ہوں۔ تنہائی ہے، میں خود تمہیں گناہ کی طرف بلاتی ہوں، تم میری طرف کیوں نہیں متوجہ ہوتے؟ تم مرد ہو؟ انہوں نے کہا کہ میں اس لیے متوجہ نہیں ہوتا کہ میرے رب نے مجھے اس کام سے منع کر دیا ہے۔ اس نے کہا: اچھا! تو پھر یہ طریقہ زندگی مجھے بھی سکھا دو۔ چنانچہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوتی ہے۔

''شکار کرنے آئے تھے شکار ہو چلے''

یہ یقین کہلاتا ہے۔

یقین کے حصول کے لیے محنت ضروری ہے:

یہ یقین کب ہے کہ یہاں بیٹھ کر باتیں کر لیں اور باہر نکل کر وہی کام کر لیں جو دوسرے کرتے پھر رہے ہیں۔ جھوٹ بھی بول رہے ہیں، غیبت بھی کر رہے ہیں، حسد بھی کر رہے ہیں، یہ باتیں اس لیے ہیں کہ یقین نہیں بنا ہوا۔ تو یقین باتوں سے

نہیں عمل سے سامنے آتا ہے۔اس لیے میرے بھائیو!اس کو بنانے کی ضرورت ہے،اس پر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔زندگیاں لگیں گی،مال لگے گا،وقت لگے گا،جانیں لگیں گی،تب جاکر ہمارے دلوں میں یقین پیدا ہوگا۔یہ جو عمر ملی ہے سو پچاس سال یہ اسی کو کمانے کے لیے ملی ہے،باقی تو ضروریاتِ زندگی ہیں،وہ تو پوری ہو ہی جاتی ہیں۔یہ یقین ہمیں بھی نصیب ہو جائے تو پھر دیکھیے کہ ہماری زندگی کی ترتیب ہی کچھ اور ہو جائے گی۔

دو انمول باتیں

دو باتیں ذہن میں رکھ لیجیے،بات پوری ہو جائے گی۔

(۱) جو سبب غم کا وہی سبب خوشی کا:

ایک تو یہ کہ اگر اللہ کے حکموں پر عمل کریں گے تو جو اسباب آپ کو ذلت کے نظر آرہے ہیں،اللہ آپ کی استقامت کی وجہ سے اسی سبب سے آپ کو عزت عطا فرما دیں گے۔جس سبب سے آپ کو رنج مل رہا ہے،اللہ اسی سبب سے آپ کو خوشی عطا فرمائیں گے۔

قرآن مجید سے دلائل:

اس کی دلیل قرآن عظیم الشان سے سنیے۔

⊙......حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کو کنویں میں ڈال دیا اور ان کا کرتہ لے کر آئے جھوٹ موٹ کا خون لگا کر۔

﴿وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ﴾ (یوسف:۱۶)

روتے دھوتے،اس کا مطلب ہے کہ آنسو ہمیشہ سچے نہیں ہوتے دھوکہ بھی دیتے ہیں اور آج تو رو دھو کر بہت دھوکے دیے جاتے ہیں۔آکر کہنے لگے:حضرت!

یعقوب علیہ السلام سے ہم اپنے بھائی کو چھوڑ کر بھاگنے کے لیے نکلے پیچھے سے بھیڑیے نے کھالیا اور ثبوت کے طور پر کرتہ دکھادیا

﴿وَ جَآءُوْ عَلٰی قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ﴾ (یوسف:۱۸)

اب حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل پر بیٹے کے خون آلود کرتے کو دیکھ کر ایک چوٹ پڑی، غم ملا۔ تو بتائیں غم ملنے کا سبب ظاہر میں کیا بنا؟ بیٹے کا خون آلود کرتہ۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ظاہری سبب جس کو دیکھنے سے دل کو چوٹ لگی وہ کیا تھا؟ بیٹے کا کرتہ دیکھا تھا۔ خیر! نصیحت ہو رہی ہے، قرآن میں اللہ نے اس کو احسن القصص فرمایا۔ فرعونوں کے لیے اس میں بڑی عبرت کی باتیں ہیں۔ بالآخر کیا ہوا؟ ایک وقت آیا کہ بھائی حضرت یوسف علیہ السلام سے معافی مانگنے لگے اور انہوں نے معاف فرمادیا تو بھائیوں نے بتایا کہ آپ کی جدائی میں رورو کر اباجان کی یہ حالت ہے کہ

﴿وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ﴾ (یوسف:۸۴)

''غم کے مارے بینائی چلی گئی''

اب اگر بینائی چلی جانے کا پتہ چلا تو حضرت یوسف علیہ السلام یہ فرماتے کہ میں دعا کرتا ہوں (آخر پیغمبر تھے) کہ اللہ میرے والد کو بینائی واپس عطا فرمادے۔ ایسے بھی ہوسکتا تھا، مگر نہیں۔ انہوں نے کہا:

﴿اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ﴾ (یوسف:۹۳)

''میری قمیص کو لے جاؤ''

یااللہ! راز کیا ہے؟

راز یہ ہے کہ جو سبب بنا تھا حضرت یعقوب علیہ السلام کو غم ملنے کا ان کا سبب جب اللہ رب العزت کو پسند آگیا تو اب اسی بیٹے کا قمیص آرہا ہے، جیسے ہی اس کو برکت کے وسیلے سے آنکھوں پر لگایا، اللہ نے ان کی بینائی واپس کردی۔ جو سبب ناکامی کا نظر آتا

ہے اللہ اسی میں سے کامیابی عطا فرماتے ہیں۔

⊙......اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو حکم دیا کہ اپنے بیٹے کو پانی میں ڈال دیجیے۔

﴿وَ اَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ﴾ (القصص:۷)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے وحی نازل کی، ہم نے الہام ڈالا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں، کہ اگر آپ کو اس کے بارے میں ڈر لگے کہ فرعون کے سپاہی اس کو پکڑ کر نہ لے جائیں تو

﴿فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ﴾

''اس کو دریا میں ڈالو''

﴿فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ﴾ (طٰہٰ:۷)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو وہ پکڑے گا جو اس کا بھی دشمن ہوگا اور میرا بھی۔ واہ میرے مولا! یہ بچے کو بچانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ ساتھ فرما رہے ہیں اس کو پکڑے گا وہ جو اس کا بھی دشمن ہوگا اور میرا بھی دشمن۔ مگر تسلی دی، فرمایا:

﴿وَ لَا تَخَافِيْ وَ لَا تَحْزَنِيْ﴾

''خوف بھی نہ کھانا اور دل میں رنجیدہ بھی نہ ہونا''

﴿اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ (القصص:۸)

''اس کو تمہارے پاس لوٹائیں گے۔ اور ہم نے اس کو رسولوں میں سے بنایا ہے۔''

اب عورت، بیٹے کے معاملے میں اتنی حساس ہوتی ہے کہ اگر اس کو وہم پڑ جائے کہ اس کے بچے کا نقصان ہو جائے گا تو وہ کبھی ادھر قدم بھی نہیں اٹھائے گی اور یہاں حکم ہو رہا ہے کہ بیٹے کو پانی میں ڈال دو۔ ان کی عقل کہتی ہوگی کہ اگر اللہ نے بچے

کو بچانا ہے تو پھر میرے گھر فوجی آئیں ہی نہ۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ میں اس کو کسی غار میں چھوڑ آتی ہوں، ادھر کوئی جائے گا ہی نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ بھی تو مشاہدے کے خلاف کرواتے ہیں۔ فرمایا کہ ڈالنا ہے تو پانی میں ڈالو۔ عقل کیا کہتی ہے؟ عقل کہتی ہے، بی بی! اگر بیٹے کو پانی میں ڈال دیا تو بیٹا تمہارا گیا۔ وہ کیسے؟ چھوٹے بچے کو باکس میں ڈال کر پانی میں ڈالنا ہے۔ تو بھئی! باکس میں سانس لینے کے لیے سوراخ بھی رکھنے پڑیں گے تو ان سوراخوں سے پانی جائے گا اور بچہ ڈوب کر مر جائے گا اور اگر پانی سے بچانے کے لیے سوراخ بند کریں گے تو بچہ آکسیجن کی کمی سے مر جائے گا۔ عقل کہتی ہے: تیرا بچہ نہیں بچے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ایک عورت ہے مگر اللہ رب العزت کی ذات پر یقین ہے، وہ مشاہدے کو نہیں دیکھتی کہ ہوگا کیا؟ وہ کہتی ہے کہ میرے مالک کا حکم ہے۔ مالک کا معاملہ دیکھو، ماں کو بیٹے کے معاملے میں آزماتے ہیں، اللہ اکبر۔

آپ ذرا ماں کے جذبات کا احساس رکھیے۔ یا آپ کو اللہ تعالیٰ شادی کے دس پندرہ سال بعد ایک ہی بیٹا عطا فرمائے، اور پھر اس بچہ کو کہیں پانی میں ڈالنا پڑ جائے تو پھر دل کی حالت بھی ذرا دیکھ لیجیے۔ وہ ماں ہے، امتحان ہو رہا ہے مگر یقین بنا ہوا تھا۔ جب یقین بن جاتا ہے تو پھر عورتیں بھی اس میدان میں مردوں سے آگے نکل جاتی ہیں، ایسا یقین اللہ تعالیٰ ہر ایک کو عطا فرمائے۔ بی بی ہاجرہ کو اللہ نے کیسا یقین دیا تھا کہ مردوں سے بھی آگے نکل گئیں۔

اب انہوں نے بچے کو پانی میں ڈال دیا اور واپس آ گئیں۔ پتہ نہیں گھر آتے ہوئے ان کے قدم کتنے بوجھل ہو رہے ہوں گے۔ آج اگر ماں بچے کو رخصت کرے تو دو منٹ کے بعد اس کو میسج کرتی ہے کہ میں آپ کو مس کر رہی ہوں، تو جب وہ ماں اپنے بچے کو پانی میں ڈال کر آ رہی تھی تو کتنا مس کر رہی ہوگی!؟ رات اپنے گھر میں آ گئی۔

ادھر کیا معاملہ بنا؟ فرعون اپنی بیوی کے ساتھ دریا کے کنارے ٹہل رہا ہے، اس کے اردگرد اس کی خدمت کے لیے آٹھ سو غلام تھے۔ کسی نے باکس کو دیکھا تو پکڑا اور ان کے حوالے کر دیا۔ اس نے کہا: کھولو! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ﴾ (طٰہٰ:۳۹)

''اے میرے پیارے موسیٰ! ہم نے آپ کے چہرے پر محبت کی تجلی ڈال دی تھی۔''

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چہرے پر ایک جاذبیت تھی، مقناطیسیت تھی، ایسی محبوبیت تھی کہ فرعون کی بیوی نے دیکھا تو خاوند سے کہنے لگی:

لَا تَقْتُلُوْهُ

''اس کو قتل نہ کرنا''

﴿عَسٰۤی اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا﴾ (القصص:۹)

''ہم اسے کو بیٹا بنائیں گے اور فائدہ اٹھائیں گے''

اب اتنا ظالم فرعون جو ہزاروں بچوں کو ذبح کروا چکا تھا اس نے بیوی کے کہنے پر اس بچے کو چھوڑ دیا۔...... لوگ کہتے ہیں کہ بیوی کی کوئی نہیں مانتا، بیوی کی تو بڑے بڑے فرعون بھی مانتے ہیں۔ یہ ہوم گورنمنٹ ہوتی ہی ایسی ہے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ بڑا مضبوط ہوتا ہے...... چنانچہ اس نے ایک آرڈر جاری کیا اور کہا: لَا تَقْتُلُوْهُ اس نے کہا: ٹھیک ہے، ہم اس کو بیٹا بنا لیتے ہیں۔ عقل نے دھوکہ دیا۔ فرعون کے دل میں یہ بات آئی کہ جب میں اس کو اپنا بچہ بنا کر اپنے گھر میں پالوں گا تو یہ میرا مرہون منت ہوگا تو کیا یہ مجھ سے تاج چھینے گا؟ مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا، اس لیے میں اس کو اپنا بیٹا بنا لیتا ہوں۔ اتنا خوش ہوا تھا کہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس نے اسی وقت آٹھ سو غلاموں کو آزاد کر دیا۔

روح المعانی میں ایک عجیب نکتہ لکھا ہے: وہ فرماتے ہیں کہ اللہ والے جہاں بھی جاتے ہیں لوگوں کے لیے انسانوں کی غلامی سے اور نفس کی غلامی سے نجات کا سبب بن جایا کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے بھی غلاموں کو آزادی نصیب ہوگئی۔

فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گھر لے آیا۔ اب اس زمانے میں ڈبے کے دودھ نہیں ہوتے تھے: عورتیں دودھ پلاتی تھیں۔ کہنے لگا: عورتوں کو بلاؤ، دودھ پلانا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ﴾ (القصص:۱۲)

''اور ہم نے دوسری عورتوں کا دودھ ان پر حرام کر دیا۔''

جو عورت آتی ہے، فیڈ دینے لگتی ہے، بچہ فیڈ نہیں لیتا تھا۔ بھوک کی وجہ سے روتا ہے۔ فرعون کی بیوی کو کچھ ہوتا ہے اور اس کو دیکھ کر اس کو بھی کچھ ہوتا ہے۔ عورتیں آتی رہیں اور بچہ دودھ نہیں پیتا۔ ساری رات بے چینی میں گزری۔ صبح کو فرعون کا یہ حال تھا کہ کہتا تھا کہ کوئی عورت تو ایسی آئے جو بچے کو دودھ پلائے ادھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا﴾ (القصص:۱۰)

''حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے صبح بہت بے قراری کی حالت میں کی''

بھوکی تھی۔ سوچتی رہی کہ پتا نہیں رات میرے بیٹے کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا﴾ (القصص:۱۰)

''اگر ہم اسے کے دل کو گرہ نہ دیتے تو وہ رو بیٹھتی اور راز کھول بیٹھتی''

ہم نے اس کے دل کو گرہ دے کر تسلی دے دی۔ کہنے لگی: جاؤ بیٹی! بھائی کا پتہ

کرو۔ وہ بھاگتی گئی۔ اس نے تماشا دیکھا کہ عورتیں دودھ پلانا چاہتی ہیں اور بچہ دودھ نہیں پیتا۔ تو وہ فرعون سے کہنے لگی:

﴿هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ﴾

(القصص:۱۲)

''میں تمہیں بتاؤں ایسے گھر والوں کے بارے میں کہ جو اس کی کفالت بھی کرے اور دودھ بھی پلائے اور اس کی خیر خواہ بھی ہو۔''

یہ بات فرعون کے ذہن میں کھٹکی تو سہی کہ یہ کیوں کہہ رہی ہے کہ وہ تمہاری خیر خواہ ہوگی۔ چنانچہ اس نے پکڑا اور کہا کہ اے لڑکی! کیوں یہ کہہ رہی ہو؟ وہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن تھی، کہنے لگی: ہم آپ کی قوم ہیں، آپ کی ملت ہیں، آپ کی عوام ہیں، ہم آپ کی خیر خواہی نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ اس نے کہا: بالکل ٹھیک ہے۔ اس نے کہا: امی چلو۔ لو جی امی صاحبہ بھی آ گئیں۔ فرعون کی ایسی مت ماری گئی کہ اس کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ رات کا جاگا ہوا تھا، کہتا تھا کہ بچہ کسی کا دودھ پی لے اور مجھے سکون کی نیند آ جائے۔ فرعون خدائی کا دعویٰ کرنے والا تھا، اس کی مت ماری گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ آئیں، انہوں نے دودھ پلایا تو بچے نے دودھ پی لیا۔ وہ بھی سب خوش ہو گئے۔ فرعون نے کہا: اچھا! اس عورت کو جانے نہ دینا، یہیں رہے اور اس سے کہو کہ بچے کو دودھ پلائے اور وہ جا کر رضائی لے کر سو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ دو تین دن رہیں۔ پھر کہنے لگیں کہ میں تو یہاں نہیں رہوں گی مجھے تو اپنا گھر اچھا لگتا ہے۔ بات بھی ٹھیک ہے ''اپنا گھونسلا اپنا کچا ہو کہ پکا''۔ اس نے کہا کہ میں تو گھر جا رہی ہوں۔ جب اس نے یہ کہا تو فرعون کہنے لگا: بی بی! اکیلی نہ جانا بچے کو بھی اپنے ساتھ لے جانا اس کو اپنے گھر میں دودھ پلاتی رہنا اور میں تمہاری تنخواہ بھی بھیج دیا کروں گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (القصص:۱۳)

''ہم نے بچے کو اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور اس کا دل خوف زدہ نہ ہو اور وہ جان لے کہ بے شک اللہ کے وعدے سچے ہیں''

بھئی! بات سچی ہے، ہمیں یہ بات ابھی سمجھ میں نہیں آئی، اللہ کرے سمجھ میں آ جائے اور ہم اس کو سیکھنے کے لیے نیت کر لیں۔ یہ تو ایک عورت کا یقین تھا۔

اب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے بنی اسرائیل کو نجات عطا فرمائی اور نجات کے لیے فرعون کو زمین میں بھی تو دھنسایا جا سکتا تھا، آسمان سے پتھروں کی بارش بھی برسائی جا سکتی تھی، زمین میں زلزلہ بھی آ سکتا تھا، سینکڑوں صورتیں ہو سکتی تھیں۔ مگر نہیں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نجات دی تو فرعون کو پانی میں ڈبو کر، وجہ کیا تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو غم ملا تھا تو بیٹے کو پانی میں ڈالتے ہوئے۔ جو سبب غم کا تھا اللہ نے اسی سبب کو خوشی کا بنا دیا اور جب سنا کہ فرعون پانی میں ڈوب گیا ہے تو کہنے لگی۔ الحمدلله

اگر آپ یقین کے ساتھ اللہ کے حکموں پر چلیں گے تو جو سبب پریشانی کا ہو گا اللہ اسی سبب میں سے سکون عطا فرما دیں گے۔

(۲) ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'':

دوسری بات، ایک نکتہ سمجھیے کہ جیسے ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ کریں گے اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ویسا ہی معاملہ فرمائے گا۔ اس کو کہتے ہیں: ''جیسی کرنی ویسی بھرنی''۔ یہ پکی بات ہے، یہ سو فیصد پکا اصول ہے۔ ہم اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھیں گے تو اللہ تعالیٰ ویسا ہی معاملہ فرمائیں گے اور اگر ہم اللہ سے نظر ہٹا کر غیروں پر نظر

ڈالیں گے تو اللہ ہمارے ساتھ ویسا ہی معاملہ فرمائے گا۔ بندہ جیسا عمل کرتا ہے اللہ کی طرف سے ویسا ہی ردعمل ہوتا ہے۔ جیسا Action ویسا Reaction۔

قرآن مجید سے دلائل:

قرآن مجید سے چند مثالیں سمجھیں تو اور مزہ آئے گا۔

⊙ ...... بنی اسرائیل کی توبہ قبول کرنے کے لیے یہ دستور بنا دیا گیا تھا کہ تم اپنی بستیوں سے باہر نکلو ہم بادل کے ذریعے اندھیرا کر دیں گے۔

﴿فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرۃ:۵۴)

''تم چھریاں اپنے جسم پر مارو اور اپنے آپ کو زخمی کرو''

خون بہاؤ۔ قرآن مجید میں ہے کہ پھر ان کی توبہ کی قبولیت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب کتنی عجیب بات ہے کہ توبہ کی قبولیت کے لیے فرمایا کہ اپنا خون نکالو۔ امت محمدیہ کے لیے تو یہ نہیں ہے۔ امتِ محمدیہ کے لیے تو یہ ہے اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ بندے نے زبان سے لفظ بھی کچھ نہیں کہا اور اٹھ کر بھی کہیں نہیں گیا، صرف دل میں نادم اور شرمندہ ہو گیا تو اللہ اس کی ندامت پر توبہ قبول کر لیتے ہیں۔

یہ فرق کیسے؟ علما نے اس کی وجہ لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں: اس کی وجہ یہ ہے ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کے سامنے اللہ کے حکم کو پیش کیا تو بنی اسرائیل نے کہا:

﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ (البقرۃ:۵۵)

ہم آپ کی بات نہیں مانیں گے جب تک کہ واضح طور پر اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہ لیں، تو انہوں نے ایمان لانے کے لیے شرط لگا دی کہ آنکھوں سے دیکھیں گے تو پھر بات مانیں گے۔ اللہ نے ان کی توبہ کی قبولیت کی بھی شرط لگا دی، اچھا! تو پھر تم بھی خون نکالو گے تو ہم مانیں گے کہ تم واقعی توبہ کرنا چاہتے ہو۔ جب کہ امت محمدیہ کے

سامنے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے پیغام کو پیش کیا تو انہوں نے بغیر کسی دلیل کے اس بات کو قبول کر لیا اس لیے رب کریم نے فرمایا کہ تم نے میرے پیغام کو بغیر دلیل کے مان لیا، میں بھی دنیا میں تم سے دلیل نہیں مانگوں گا، فقط دل سے نادم ہو جاؤ گے تو میں اس پر توبہ کو قبول کر لوں گا۔

''جیسی کرنی ویسی بھرنی''

◉ ...... ایک چھوٹی سی مثال قرآن مجید میں ہے کہ جو تہجد کی نماز پڑھتے ہیں

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ﴾ (السجدہ:۱۷)

''کوئی بھی نہیں جانتا کہ ہم نے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے جنت میں کیا تیار رکھا ہے''

اب یہاں طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں نہیں کہا کہ ان کے دل کے سکون کے لیے تیار کر رکھا ہے، ان کی دل کی خوشی کے لیے کیا تیار کر رکھا ہے؟ بات تو دل کی ہوتی ہے کہ ایسا تحفہ دو کہ دل خوش ہو جائے، دل مطمئن ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے یہاں دل کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔ کیا فرمایا؟ کوئی نہیں جانتا کہ انکی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا تیار کر رکھا ہے۔ تو مفسرین نے یہاں نکتہ لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ تہجد پڑھنے والے رات کو جاگتے ہیں تو صبح کو انکی آنکھیں نیند کو ترس رہی ہوتی ہیں، آنکھیں بوجھل ہو چکی ہوتی ہیں۔ چونکہ آنکھیں اللہ کی عبادت میں نیند کو ترسیں اس لیے رب کریم نے فرمایا کہ میں تمہارے لیے وہ انعام تیار کروں گا کہ جس کو دیکھ کر تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک مل جائے اور آنکھیں خوش ہو جائیں۔ تو ''جیسی کرنی ویسی بھرنی''

◉ ...... حضرت یوسف علیہ السلام پر بھی بہتان لگا لیکن بہتان کے جواب میں ایک بچے نے دو فقرے کہے کہ اگر آگے سے قمیص پھٹا تو اس کا قصور اور اگر پیچھے سے قمیص پھٹا تو اس

کا قصور۔ بات ختم ہو گئی۔ لیکن بی بی مریم علیہا السلام پر بھی بہتان لگا، اب اس بہتان لگنے کا واقعہ قرآن مجید میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا﴾

(مریم:۱۶)

غسل کرنے کے لیے اپنے مکان کی مشرقی سمت گئی کہ اللہ تعالیٰ نے مشرق کو قبلہ بنایا ہوا ہے۔

﴿فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا﴾

''پردہ کرلیا''

﴿فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾

''ہم نے جبرائیل کو بھیجا بھرپور مرد کی شکل میں''

اب جب بی بی مریم علیہا السلام نے ایک مرد کو سامنے دیکھا تنہائی میں تو گھبرا گئی۔ کہنے لگی:

﴿اِنِّيْ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا﴾

''میں رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں''

جبرائیل نے دیکھا کہ بی بی مریمؑ تو گھبرا گئیں، تو فرمانے لگے:

﴿اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ﴾

''میں تیرے رب کا بھیجا ہوا نمائندہ ہوں۔''

﴿لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا﴾

''تاکہ آپ کو نیک بیٹا عطا کیا جائے''

اس بات کو سن کر بی بی مریمؑ اور زیادہ گھبرا گئیں کیوں کہ عام اسباب تو یہ ہوتے ہیں کہ عورت نکاح کرے تو بیٹا ہو سکتا ہے یا گناہ کے ذریعے زنا کرے تو بیٹا ہو سکتا ہے اور بی بی مریمؑ جانتی تھیں کہ دونوں اسباب میری زندگی میں نہیں ہیں۔ چنانچہ فرمانے

لگیں:

﴿ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ ﴾

''میرا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟''

﴿ وَ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ ﴾

''نہ میں نے نکاح کیا''

﴿ وَ لَمْ اَكُ بَغِیًّا ﴾

''نہ میں نے زنا کیا''

اب جب جبرائیل علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ تو گھبرا گئی ہے تو فرمایا:

﴿ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ﴾

''تیرے پروردگار نے یہ کام میرے لیے آسان کر دیا ہے۔''

فَحَمَلَتْ ''بی بی مریم حاملہ ہو گئیں'' اب بی بی مریم بہت پریشان ہیں۔...... آپ تصور کریں کہ جس عورت نے بچپن سے اللہ کے نام پر زندگی گزاری ہو اور ان کی کفالت کے لیے لوگ ایک دوسرے کے لیے جھگڑے کرتے ہوں اور جس کو مسجد کے ماحول میں رکھا گیا ہو اور اعتکاف میں عبادت بھری زندگی گزاری ہو، وہ بچی جب جوان ہو اور حاملہ ہو جائے تو اس کو کتنا غم ہوگا......!! تو بی بی مریمؑ ایک ہارے ہوئے جرنیل کی طرح بیٹھی ہیں۔ اتنا غم اور اتنی ڈپریشن کی کیفیت ہے کہ کہتی ہیں:

﴿ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا ﴾

''اے کاش! میں اس سے پہلے مر گئی ہوتی، کوئی بھولی بسری چیز ہو چکی ہوتی۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَنَادٰهَا مِنْ تَحْتِهَا ﴾

''ہم نے اس کو اطلاع دی فرشتے کے ذریعے سے''

اَنْ لَّاتَحْزَنِیْ ''غم نہ کر''

فرمایا کہ:

﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا﴾

''تمہارے نیچے سے پانی کا چشمہ جاری کر دیا جائے گا''

﴿وَ هُزِّیْ اِلَیْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا﴾

اور یہ کھجور کی ٹہنی کو تم ہلاؤ تو کھجوریں گر پڑیں گی

﴿فَكُلِیْ وَ اشْرَبِیْ وَ قَرِّیْ عَیْنًا﴾

کھجوریں کھانا، پانی پینا اور جب بچہ پیدا ہو جائے تو اس کو دیکھنا تو تمہارا غم ختم ہو جائے گا اور جب تم اس کو لے کر قوم کے پاس جاؤ گی اور قوم تم سے پوچھے گی تو تم کہہ دینا:

﴿اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا﴾

''میں نے تو رحمٰن کے لیے روزہ رکھا ہوا ہے''

اس دور کے روزے میں بولنے کا بھی روزہ ہوتا تھا۔ چنانچہ

﴿فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ﴾

''بی بی مریم علیہا السلام قوم کے پاس اپنے بچے کو لے کر آئیں''

اور لوگ کہنے لگے

﴿یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا﴾

''او مریم! یہ کیا طوفان چیز لے کر آ گئی؟''

﴿یٰاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا﴾

''اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ برا تھا نہ تیری بہن بری تھی۔''

اب یہاں پر ایک نکتہ مل رہا ہے کہ غلطیاں نوجوان کرتے ہیں اور طعنے بھائی کو، باپ کو اور ماں کو ملتے ہیں۔ وہ مریم کو کچھ نہیں کہہ رہے تھے کہ مریمؑ! تو یہ کیا کر بیٹھی۔ یَا اُخْتَ هَارُوْنَ بھائی کی بدنامی، مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَأَ سُوْءٍ والد کا نام لیا، والدہ کا نام لیا۔ اے نوجوانو! احتیاط کی زندگی گزارنا، کہیں اپنے بڑوں کی عزتوں کو پامال نہ کر بیٹھنا۔ ماں باپ زندگیاں گزار کر عزتیں کماتے ہیں اور بچے چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر عزتوں کو گنوا بیٹھتے ہیں۔ اب جب انہوں نے یہ بات کہی تو ان کے جواب میں بی بی مریم نے فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ (بچے کی طرف اشارہ کر دیا) بعض لوگ کہنے لگے:

﴿قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾

''یہ بچہ جو گود میں ہے کیسے بول سکتا ہے؟''

بہتان حضرت یوسف علیہ السلام پر بھی لگا، مگر ان کی گواہی کے لیے دو فقرے بولے گئے کہ اگر قمیص آگے سے پھٹا تو اس کا گناہ اور اگر پیچھے سے پھٹا تو اس کا گناہ۔ بات ختم ہو گئی۔ لیکن یہاں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بولتے ہیں اور بولے بھی کیسے کہ دو فقرے نہیں بولے ذرا غور کیجیے۔ آگے کیا ہوا؟

﴿قَالَ اِنِّيْ عَبْدُاللّٰهِ﴾

''فرمایا: میں اللہ کا بندہ ہوں''

﴿ اٰتٰنِيَ الْكِتَابَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا وَّ جَعَلَنِيْ مُبَارَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّاo وَبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّاo وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَ يَوْمَ اَمُوْتُ وَ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا﴾ (مریم: ۳۰-۳۳)

اتنی لمبی گواہی! مفسرین نے یہاں نکتہ لکھا کہ وہاں بھی گواہی دی مگر دو لفظ کی اور

یہاں گواہی اتنی بڑی، انہوں نے فرمایا کہ وہاں بہتان ایک عورت نے لگایا تھا تو دو فقروں میں بات سمٹ گئی۔ یہاں بہتان قوم نے لگایا تھا، اللہ نے جواب میں بچے سے وعظ کروا دیا۔ یہاں چونکہ بہتان لگانے والی ایک پوری قوم تھی اس لیے اللہ نے دو فقروں میں بات نہیں سمیٹی، تو معلوم ہوا:

''جیسی کرنی ویسی بھرنی''

توجہ فرمائیے۔ اب بڑا علمہ نکتہ ہے۔

......ابرہہ نے ہاتھیوں کا لشکر لیا اور بیت اللہ شریف کو گرانے کے لیے آ گیا۔ اس نے ملکِ یمن میں اپنا ایک مرکز بنایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دنیا اس کو مرکز بنا دے اور یہ جو مرکز (بیت اللہ) بنا ہوا تھا اس کو مٹا دے۔ وہ ہاتھیوں کا لشکر لے کر آ گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پرندے آ گئے، جنہوں نے چھوٹی چھوٹی کنکریاں پھینکیں اور ان ہاتھیوں اور لوگوں کو کھائے ہوئے بھس کی طرح بنا دیا۔ اب یہاں پر ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہاتھیوں کو پرندوں سے کیوں مروایا گیا؟ ہاتھی زمین میں بھی دھنسائے جا سکتے تھے، بیماری بھی پیدا کی جا سکتی تھی، آگ بھی برسائی جا سکتی تھی، مگر نہیں، اللہ تعالیٰ نے پرندوں کو استعمال فرمایا۔

یہاں پر مفسرین نے ایک عجیب نکتہ لکھا کہ پرندوں کو کیوں استعمال فرمایا؟ اب اس کی عام وجہ جو مفسرین نے لکھی: وہ تو یہ ہے کہ بھئی! یہ اپنی طرف سے ہاتھیوں کو لے کر آیا جو جانوروں میں سب سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ تو جب وہ سب سے زیادہ طاقت والے جانوروں کو لے کر آیا تو اللہ تعالیٰ اس کے مقابلے میں پرندوں کو لے آتے ہیں جو طاقت میں انتہائی کمزور ہیں اور ان کا حشر تجھ کو دکھا دیتے ہیں، یہ بھی طاقت کا جواب ہے۔

مگر مفسرین نے ایک عجیب جواب لکھا جو اس مضمون کے متعلق ہے۔ وہ کیا کہ

جیسا عمل ویسا ردعمل

"جیسی کرنی ویسی بھرنی"

محققین نے یہ بات لکھی ہے: وہ فرماتے ہیں کہ ابرہہ چلا کس نیت سے تھا؟ وہ چلا اس نیت سے تھا کہ عزت والے گھر بیت اللہ کو گرادوں اور اپنا گھر جس کی عزت نہیں اس کو عزتوں والا بنادوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ترتیب کو الٹ کرنے چلا تھا کہ عزت والے گھر کو مٹا دوں گا اور جس کی عزت نہیں اس کو عزت دلاؤں گا۔ جب ابرہہ اس نیت سے چل کر آیا تو رب کریم نے بھی ترتیب الٹ کر دی کہ میرے بندو! عام دستور یہی ہے کہ تم صیاد (شکاری) بنتے ہو اور پرندے تمہارا شکار ہوا کرتے ہیں۔ تم نیت بدل کر آرہے ہو، ترتیب بدل کر آرہے ہو، ہم بھی ترتیب بدل کر دکھا دیتے ہیں۔ آج تم شکار بنو گے اور پرندے صیاد ہوں گے، وہ اوپر سے کنکریاں پھینکیں گے، میں ان کے ذریعے سے تمہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح بنا دوں گا۔

حاصلِ کلام:

تو اگر ہمارے دلوں میں اللہ کی ذات کا پکا یقین آجائے تو ہمیں زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ عزتیں عطا فرمائیں گے اور آخرت میں بھی عزتیں عطا فرمائیں گے۔ اب اس یقین کو سیکھنے کے لیے دعوت و تبلیغ کے نام سے ایک محنت ہو رہی ہے۔ الحمد للہ پوری دنیا میں ہو رہی ہے اور اسمیں یہ بات سکھائی جاتی ہے کہ ذرا اپنے گھروں سے نکلو، اسباب کے ماحول سے ذرا باہر نکلو اور اللہ کے راستے میں قدم اٹھاؤ تو تمہیں اللہ کی مدد کی سمجھ آجائے گی، تمہیں اللہ کے ساتھ ایمان اور تعلق کی سمجھ آجائے گی۔ تو واقعی انسان کا ایمان یقین بڑھتا ہے اور انسان کو زندگی کا صحیح راستہ نظر آجاتا ہے۔ اب اس راستے کو سیکھنے کے لیے آپ حضرات ارادہ فرمالیں، آپ حضرات اس کے مطابق

اپنے اوقات کو فارغ کیجیے اور اس یقین کو سیکھنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یقین بھری زندگی نصیب فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾

ذکرِ کثیر کے فوائد

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

اقتباس

جس چیز کا جتنا زیادہ تذکرہ کرنا شروع کردیں اس کا اتنا ہی زیادہ پانے کو جی چاہے گا۔ ایک دن کوئی تذکرہ کر دے کہ انناس کیسا پھل ہے؟ کوئی دوسرے دن تذکرہ کردے، دو چار مرتبہ تذکرہ ہو تو ہر بندہ کہے گا کہ انناس کھانے کو جی چاہتا ہے۔ تو ذکر سے ذات کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے جو حضرات کثرت سے ذکر کرتے ہیں پھر ان کو دونوں چیزیں نصیب ہو جاتی ہیں۔ فکر کی گندگی بھی دور ہو جاتی ہے اور اللہ رب العزت کی محبت سے دل بھی لبریز ہو جاتا ہے۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

ذکرِ کثیر کے فوائد

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ o بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o
﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا o وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا﴾ (الاحزاب:۴۱-۴۲)
قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي مَقَامٍ آخَرَ
﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ (المزمل:۸)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ o وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ o
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

ذکرِ کثیر کے حکم میں راز:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرو‘‘۔ اس آیت کریمہ میں پروردگارِ عالم نے اپنی یاد کا حکم دیا۔ مگر ایک نشاندہی بھی فرما دی کہ ذکر کثرت کے ساتھ کرنا ہے۔ یہ نشاندہی فرمانے میں ہمارا بہت فائدہ ہو گیا۔ اس لیے کہ ڈاکٹر جب کوئی دوائی دیتا ہے تو بتاتا ہے کہ اس دوائی کو آپ نے دن میں ایک مرتبہ لینا ہے۔ صبح و شام لینا ہے یا صبح، دوپہر اور شام لینا ہے۔ دوائی کی مقدار کا صحت کے حاصل ہونے میں بڑا دخل ہے۔ اگر وہ دوائی دن میں تین مرتبہ کھانی تھی اور کوئی آدمی اس کو تیسرے دن کھالیتا ہے تو اس کو شفا نہیں ہو گی۔ حالانکہ دوائی ٹھیک تھی لیکن مقدار پوری نہیں تھی۔

اسی طرح وہ سالکین جو ذکر تو کرتے ہیں لیکن مراقبہ میں وقت پورا نہیں دیتے۔ کبھی پوچھیں تو پانچ منٹ کا مراقبہ، کبھی پوچھیں تو دس منٹ کا مراقبہ۔ منٹوں میں مراقبے سے دل نہیں بنا کرتے۔

دنیا کے بادشاہوں کا دستور ہے کہ ان کی ملاقات کے لیے جب بھی کوئی آتا ہے، تو گھنٹوں اسے انتظار میں بٹھاتے ہیں۔

آپ کسی دفتر میں وزیر کو ملنے جائیں، صدر کو ملنے جائیں، گھنٹوں دفتر میں انتظار کرنا پڑے گا۔ اس پروردگار کے ہاں بھی یہی معاملہ ہے کہ جو اس کی ملاقات چاہے، جو اس کی محبت چاہے، جو اس کا وصل چاہے وہ بھی گھنٹوں اپنی یاد میں بٹھاتے ہیں۔ دن بسر ہوتے ہیں، زندگی گزرتی ہے اللہ کی یاد میں۔ اس لیے کہ تھوڑا ذکر انسان کو فائدہ نہیں دیتا۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذَالِكَ لَا اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَ لَا اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ﴾ (سورۃ النساء: ۱۴۳)

"وہ ذکر نہیں کرتے مگر تھوڑا سا، لٹکے ہوئے ہیں دونوں کے بیچ نہ ان کی طرف نہ ان کی طرف"

تو یہ نشاندہی فرما دی کہ ذکر کثرت کے ساتھ! اس میں بڑا راز پنہاں ہے۔

بے جا شکوہ:

آج سالکینِ طریقت ذکر کرتے نہیں اور پھر شکوہ بھی کرتے ہیں کہ جی فائدہ نہیں ہوتا۔ آنکھ قابو میں نہیں، دل قابو میں نہیں۔ بھئی! بتانے والے شیخ نے نسخہ بالکل ٹھیک بتایا ہوتا ہے، کھانے والا مریض اس کی مقدار کا خیال نہیں رکھتا۔ اسی لیے جب بھی معمولات کے بارے میں پوچھیں تو کہتے ہیں جی حضرت! بس کیا کریں مراقبے کا وقت نہیں ملتا۔

اب بتایئے کہ وہ کیسا مجنوں جس سے پوچھیں تو کہے لیلیٰ کو یاد کرنے کا وقت نہیں ملتا۔آج ہماری وہی حالت ہے۔دنیا سمجھتی ہے یہ سالک ہیں،صوفی ہیں۔یہ فلاں شیخ سے بیعت ہیں اور اس سب کے باوجود ہم اپنے معمولات کو وقت نہیں دیتے۔ ہمارے مشائخ نے فرمایا:

مَنْ لَّا وِرْدَ لَهٗ لَا وَارِدَ لَهٗ

''جس آدمی کا ورد نہیں اس پر واردات نہیں ہوں گی''

واردات کے ہونے کے لیے ورد ہونا لازمی ہے۔تو یہ جو معمولات بتائے جاتے ہیں یہی تو بنیاد ہیں۔انہیں کو باقاعدہ کر لیجیے۔استقامت کے ساتھ،پابندی کے ساتھ کیجیے۔پھر اس کی برکتیں اپنی آنکھوں سے دیکھیے۔

جس بندے کو کسی نسخے سے شفا ملے وہ تو اس نسخے کو ہر ایک کو بتاتا ہے۔ہمارے مشائخ کا بھی یہی معمول ہے۔انہوں نے اس ذکر کے نسخے سے شفا پائی اور اسی پیغام کو انہوں نے اس دنیا میں پہنچایا۔ہر ایک کو بتایا کہ بھئی ذکر کی کثرت کرو۔

فکر کی گندگی کیسے دور ہو؟

ایک اصولی بات کو یاد رکھ لیجیے کہ فکر کی گندگی ہمیشہ ذکر سے دور ہوتی ہے۔جو بندہ چاہے کہ میرے خیالات پاک ہو جائیں۔نفسانی،شیطانی،شہوانی خیالات کا جو ہجوم ہے میری سوچوں میں،دماغ میں وہ ختم ہو جائے۔تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ وہ کثرت کے ساتھ اپنے رب کو یاد کرے۔اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔علم کے حاصل ہونے سے وساوس سے نجات نہیں ملتی،عبادت زیادہ کرنے سے وساوس سے نجات نہیں ملتی۔اللہ کے راستے میں خیرات زیادہ کرنے سے وساوس سے نجات نہیں ملتی۔

جس آدمی کو بخار ہو،وہ وٹامن کھالے تو یہ کھانے سے بخار دور نہیں ہوتا۔کوئی

درد کی گولی کھانے سے بخار دور نہیں ہوتا۔ ہاں! اینٹی بائیوٹک ایسی دوائی ہے کہ جب وہ اسے استعمال کرے گا تو اللہ رب العزت جلدی شفا عطا فرمائیں گے۔ اس لیے کہ وہ بنی ہی اسی بیماری کو دور کرنے کے لیے ہے۔ ''ذکر اللہ'' دلوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ چنانچہ نبی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

((ذِكْرُ اللّٰهِ شِفَاءُ الْقُلُوْبِ))

''اللہ رب العزت کا ذکر دلوں کے لیے شفا ہے۔''

تو اس سے شفا ملتی ہے۔

جذبِ فیض کے لیے قلب کی استعداد بنانے کا طریقہ:

ایک نقطے کی بات عرض کرتا چلوں کہ قرآن مجید میں بھی شفا ہے۔

﴿وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

﴿فَاِذَا مَرِضْتُ وَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾

﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾

﴿هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾

﴿وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّ رَحْمَتٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾

﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَاءٌ﴾

یہ شفا ہے مگر کیسے؟ اس بات کو ذرا تفصیل سے سمجھیں۔ ایک حافظ صاحب جو بچوں کو ناظرہ قرآن پڑھاتے ہیں۔ صبح سے لیکر مغرب تک یا عشاء تک۔ ہر وقت قرآن مجید کی آواز ان کے کانوں میں پڑ رہی ہے۔ ایک وقت میں پانچ پانچ بچے۔ سات، سات بچے منزل سنا رہے ہیں اور وہ سب کی غلطیوں کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ منزل سن رہے ہیں۔ قرآن مجید کے بارے میں فرمان الٰہی ہے:

وَ إِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ أَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿

(الانفال:۲۰۴)

''اور جب قرآن مجید پڑھا جائے تو تم اسے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحمتیں برسیں۔''

تو قرآن کی تلاوت سے رحمتوں کے برسنے کا ثبوت قرآن مجید سے مل رہا ہے۔ جب ایک بندے کی تلاوت سے رحمتیں برستی ہیں تو جس استاد کے گرد پچاس یا ستر بچے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے ہیں، تو وہاں کتنی رحمتیں برس رہی ہوں گی۔ اب یہ حافظ صاحب جو صبح سے لے کر عشا تک قرآن مجید کی تلاوت کرتے بھی ہیں سنتے بھی ہیں۔ اب یہ اگر شیخ کو بتاتے ہیں کہ حضرت میری نگاہ میرے قابو میں نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی فکر والی بات تو ہے نا۔ کہیں نہ کہیں مصیبت تو ہے نا کوئی۔

قرآن مجید کی رحمتوں میں تو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ اور پچاس بچے بیٹھے قرآن مجید پڑھ رہے ہیں اور کوئی گھنٹے، دو گھنٹے کی بات نہیں۔ صبح سے لیکر شام تک پڑھ رہے ہیں پھر اس قرآن پاک کے انوارات دل کو منور کیوں نہیں کر رہے؟ پھر دل سے زنگ دور کیوں نہیں ہو رہا؟ دل کے اندر یہ شہوات ختم کیوں نہیں ہوتیں؟

آخر ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بچہ سبق سنا رہا ہے کئی مرتبہ استاد کی نظر اسی بچے کے اوپر بری پڑ رہی ہوتی ہے۔ آخر اس مصیبت میں کیا راز ہے؟ اگر اتنا قرآن مجید سن کر بھی اس بندے کا تصفیہ قلب نہیں ہوتا تو اور کہاں ہوگا؟ شفا کیوں نہیں ہو رہی؟ ہمارے مشائخ نے اس کا حل بتایا:

وہ فرماتے ہیں کہ دیکھو! جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ابتداء میں اس کا نظام انہضام (ڈائجسٹیو سسٹم) اتنا کمزور ہوتا ہے کہ وہ بہت ہلکا دودھ پی سکتا ہے۔ بھاری دودھ نہیں پی سکتا۔ چنانچہ اس کو ماں اپنا دودھ پلاتی ہے یا پھر بکری کا دودھ پلاتے ہیں۔ وہ یہ

ہضم کر لیتا ہے۔ اگر آپ اس کو پہلے دن بھینس کا دودھ پلا دیں تو اس کا ہاضمہ خراب ہو جائے گا، صحت کی بجائے الٹا اس کو بیماری ہو جائے گی۔ تو ماں کا دودھ پیے نہیں تو بکری کا دودھ، پھر جب اس کی صحت اور اچھی ہو گئی، بڑا اور جوان ہو گیا۔ اس کو اب آپ اگر بھینس کا دودھ بھی پلا دیں گے تو وہ اس کو بھی ہضم کر لے گا۔ اس لیے کہ اس کی استعداد بڑھتی چلی گئی۔

بالکل اسی طرح ایک سالک بالکل ابتداء میں جب بیعت ہوتا ہے، دین کی طرف آتا ہے، ابھی اس کے اندر استعداد نہیں بنی ہوتی۔ قرآن مجید کے انوارات کے نزول میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس کا قلب ان انوارات کو جذب نہیں کر رہا ہوتا۔ چکنے گھڑے پہ بارش ہوتی ہے، پانی کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ ابتدا ہی میں بے چارہ چکنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے انوارات تو ہوتے ہیں مگر اس پر اثر نہیں ہو رہا ہوتا۔ کیوں کہ قرآن مجید کے انوارات میں ثقل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ (الحشر:۲۱)

''اگر ہم یہ قرآن پہاڑ پر اتارتے (نازل فرماتے) تو تو دیکھتا کہ وہ دب جاتا پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے''

یہ ایسا کلام ہے، ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا﴾ (المزمل:۵)

اس قول کے اندر ثقل (بھاری پن) ہے۔ یہ ہر بندے کے بس کی بات نہیں کہ اس کو اپنے قلب کے اندر جذب کر سکے۔ اس کے لیے قلب کی استعداد بنانی پڑتی ہے۔ تو مشائخ ہر آنے والے اور توبہ کرنے والے سالک کو ذکر کی تلقین کرتے ہیں۔ اس لیے کہ جو ذکر کا نور ہے وہ انتہائی لطیف اور ہلکا ہے۔ کتنا ہی گناہ گار بندہ

کیوں نہ ہو، جب بھی اللہ کے نام کا ذکر کرے گا فائدہ ضرور پائے گا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے نام میں اتنی برکت ہے کہ ریا کاری سے بھی اگر کوئی بندہ نام لے گا تو اس کا فائدہ وہ بھی ضرور پائے گا۔ یہ نام ایسا ہے کہ اگر ابتداء میں اس کا ذکر کیا جائے تو قلب اس کا نور جذب کرتا ہے۔ قلب کی استعداد بڑھتی رہتی ہے۔ حتی کہ ایک وقت آتا ہے کہ پھر سالک کا قلب قرآن مجید کے انوارات کو جذب کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پھر تلاوت کی جاتی ہے تو اس کا دل منور ہو جاتا ہے، اس کا ایمان بڑھتا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ جب یہ نماز پڑھتا ہے تو نماز کے انوارات کو بھی یہ قبول کرتا ہے۔

نقشبندی سلوک یقیناً موصل ہے:

ہمارے علمائے کرام (مشائخ) نے باقاعدہ اس کا کورس ترتیب دیا ہے۔ اور اس کورس کو سلوک کہتے ہیں۔ ہمارے اس سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے اسباق ہیں اور مشائخ ہر آنے والے کو (سالک کو) اس پر چلاتے ہیں۔

جیسے آجکل موٹروے بنا ہوتا ہے کہ آپ ایک جگہ سے اینٹر ہوں (داخل ہوں) تو کہیں آپ نکل نہیں سکتے، سوائے اس منزل کے جہاں آپ کو پہنچنا ہے۔ ایسی سڑکیں ترقی یافتہ ملکوں میں بنی ہوئی ہیں کہ جو بندہ داخل ہو جائے اب وہ نکل نہیں سکتا، دونوں طرف دیواریں ہیں، جہاں منزل آئے گی، وہاں وہ نکل سکے گا۔ تو منزل تک پہنچے بغیر وہ رہ نہیں سکتا۔

حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

”ہمارے مشائخ نے اللہ رب العزت سے ایسا سلوک مانگا ہے، جو یقیناً موصل ہے۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بندہ اس راستے پر چلے گا تو اللہ رب العزت کی مہربانی

شامل حال ہوگی اور وہ یقیناً اپنی منزل پر پہنچے گا۔

تو اس بات کو اپنے مکتوبات میں لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ''ہمارے ہاں سالک کی سستی کے سوا اور کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔''

اگر کوئی چلنے والا بندہ ہی گاڑی بند کر کے کھڑا ہو جائے تو وہ گاڑی منزل پر نہیں پہنچے گی، چلتی رہے گی تو منزل پر پہنچے گی۔ دیر یا سویر یہ علیحدہ بات ہے۔ ہمارا سلوک بھی ایسا ہے۔

تو جو سالک اس راستے پر چلتا رہے دیر یا سویر منزل پر ضرور پہنچے گا۔ ہاں! سست ہو جائے، معمولات ہی کرنا چھوڑ دے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے وہ انجن ہی بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ لہٰذا سالکین کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنے معمولات کو اپنے کھانے پینے سے زیادہ ضروری سمجھیں۔ ناشتہ چھوٹ سکتا ہے، دوپہر کا کھانا چھوٹ سکتا ہے، رات کا کھانا چھوٹ سکتا ہے، نیند کم ہو سکتی ہے، مگر ہمارے معمولات کم نہیں ہو سکتے۔ جب سالک کی یہ کیفیت بن جائے گی تو پھر یہ اوراد و وظائف اس کو فائدہ دینے لگ جائیں گے۔ ابتداء میں خود کوشش کرنا پڑتی ہے۔

ابتداء میں اوراد و وظائف کی حیثیت:

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مبتدی کے لیے اوراد و وظائف دوا کی مانند ہیں، اور منتہی کے لیے اوراد و وظائف غذا کی مانند ہیں۔

کئی دفعہ کڑوی دوائی پینا بڑی مشکل ہوتی ہے۔ بچوں کو کڑوا کھانسی والا شربت پلائیں تو وہ منہ بناتے ہیں کہ یہ دوائی نہیں پینی لیکن اگر اسی بچے کو آئس کریم کھلائیں تو وہ ایک پلیٹ کھانے کے بعد بھی تمنا کرے گا کہ ایک پلیٹ اور ہو جاتی۔ تو ابتدا میں سالک کو اپنے آپ کو ذکر پر لگانا پڑتا ہے۔ نفس نہیں چاہتا، مارے باندھے بٹھانا پڑتا ہے۔ اب اس میں بھی شیطان ذہن میں وساوس ڈالتا ہے۔ اکثر و بیشتر سالکین آکر

کہتے ہیں:

''حضرت میں تو بیٹھتا ہوں، مجھے تو نیند آ جاتی ہے تو پھر بیٹھنے کا کیا فائدہ؟''

او اللہ کے بندے! بھلے نیند آ جائے، بیٹھنے کا فائدہ ہے۔ اس لیے کہ عام سالک کو نیند میں اور ذکر کے کرنے کے وقت میں جو بندے کی کیفیت ہوتی ہے، اس میں وہ فرق ہی نہیں کر سکتا۔ اس کو کیا پتہ کہ وہ نیند تھی یا نعاس تھا؟

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً﴾

یہ بھی ایک اونگھ کی قسم ہوتی ہے، مگر عام بندہ فرق نہیں کر سکتا۔ مگر اس نعاس کی کیفیت میں اس کے لطائف پرواز کر رہے ہوتے ہیں۔ انجن سٹارٹ ہو چکا ہوتا ہے، وہ چل رہا ہوتا ہے، ترقی مل رہی ہوتی ہے۔

اگر کوئی فقیر کسی بادشاہ کے دروازے پر فجر پڑھ کے بیٹھ جائے اور ظہر تک انتظار میں بیٹھا رہے، اس دوران اس کو گھنٹہ، دو گھنٹہ اونگھ بھی آ جائے اور بادشاہ ظہر کے وقت پوچھے: تم کب میرے در پر آئے؟ تو وہ کیا بتائے گا؟ دو گھنٹے کم کر کے کہے گا یا یہ کہے گا کہ فجر پڑھ کے آیا ہوا ہوں؟ اس لیے کہ جب در پر آ گیا پھر اگر نیند آ بھی گئی تو در پر بیٹھنے والوں میں تو شمار ہو ہی جائے گا۔ تو سالک جب مصلے پر بیٹھ گیا، دنیا کو اس نے چھوڑ دیا، اب اس کو تھکاوٹ ہے یا کوئی بھی وجہ ہے جس سے نیند آ گئی، تو اس نیند کی وجہ سے اس کی باطنی ترقی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

محبت الٰہی ناپنے کا پیمانہ:

اس لیے سالک کو چاہیے کہ بیٹھنے کی پابندی کرے۔ اگر کوئی معلوم کرنا چاہے کہ مجھے اللہ رب العزت سے کتنی محبت ہے؟ تو وہ ذرا دیکھے کہ مصلے پہ بیٹھنے کا شوق کتنا ہے؟

جب مصلے پر بیٹھنے سے وحشت ہو، بس آیا اور دو رکعت پڑھ کے بھاگا، سنت موکدہ پڑھیں اور فرض پڑھے باقی سب کچھ چھوڑ کے اٹھ گیا۔ جب یہ حالت دیکھیں کہ مصلے پہ بیٹھنے سے وحشت ہوتی ہے، سمجھ لیں کہ نہیں ابھی دوری ہے۔ اس لیے جب مومن مسجد میں آتا ہے، تو حدیث پاک میں فرمایا گیا:

اَلْمُؤْمِنُ فِي الْمَسْجِدِ كَالسَّمَكِ فِي الْمَاءِ

''مومن کو مسجد میں ایسے سکون مل جاتا ہے جیسے مچھلی کو پانی میں سکون ملتا ہے۔''

مراقبے کے لیے وقت متعین کرنا ضروری ہے:

تو سالک کو چاہیے کہ اپنے نفس کو مارے، باندھے، خود کو بٹھائے۔ کچھ سالکین ایسے ہوتے ہیں کہ ہم ذکر کریں گے، جب وقت مل گیا۔ ناں، ناں، ناں۔

ابتدا میں وقت کو متعین کریں۔ ڈھیل دے تو نفس صبح کہے گا، شام کو کریں گے، اور شام کو کہے گا، کل صبح کو کریں گے۔ اور اسی صبح شام میں زندگی تمام ہو جائے گی۔ وقت کا تعین کر لیجیے۔ جیسے آج کل لوگ کھانا وقت پر کھا لیتے ہیں، سالک کو چاہیے کہ اس کو باطنی کھانا سمجھے۔

تَحْتَاجُ الْقُلُوْبُ اِلٰى اَقْوَاتِهَا مِنَ الطَّعَامِ

''دلوں کو بھی قوت کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔''

جیسے جسموں کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح ہم اپنا روحانی کھانا وقت پر کھانے کی پابندی کریں۔ وقت متعین کر لیں۔ ہر بندے کی اپنی کیفیت ہوتی ہے۔ کوئی عصر سے مغرب تک بیٹھ سکتا ہے، کوئی عشاء کے بعد بیٹھ سکتا ہے، کوئی فجر کے بعد۔ تو جو بھی وقت ہو اس کی پابندی کیجیے۔ اپنے نفس کو بٹھائیے۔ جو مرضی ہو۔ اب اس میں کوئی مصروفیت نکل آئے گی، ملنے والے نکل آئیں گے، مگر اس کی پابندی کیجیے۔ اہل خانہ کو بھی پتہ ہو کہ اتنے سے اتنے وقت پر یہ ذکر و مراقبہ میں بیٹھتے ہیں اور

اس وقت ان کو کسی نے ڈسٹرب نہیں کرنا۔

کچھ وقت تو ہم بھی متعین کر لیں اللہ کی یاد کے لیے تا کہ کہہ سکیں: اے اللہ! ساری دنیا سے ہٹ کٹ کے بیٹھ جاتے تھے تیری یاد کے لیے۔

نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ))

میرا اللہ کے ساتھ ایک وقت ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے (لی مع اللہ) اس وقت کی بڑی عجیب تفصیل لکھی ہے۔لیکن اتنا عرض ہے کہ ہم بھی اسی وقت کی اتباع میں اپنا وقت اللہ کے لیے فارغ کر لیں۔بس دل میں یہ سوچیں کہ میں نے اپنے رب کے سامنے بیٹھنا ہے۔

خیالات آنے سے نہ گھبرائیں:

توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کریں۔پہلے دن آپ بیٹھیں گے، ہو سکتا ہے ننانوے خیال آپ کو گندے آئیں اور صرف ایک خیال اچھا آئے۔

اسی موڑ پر علما، طلبا ذکر کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔کہتے ہیں کہ ذکر میں تو الٹا زیادہ وسوسے آتے ہیں۔بھائی! ذکر میں وسوسے زیادہ نہیں آتے۔مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کمرے کے اندر بلی نے پاخانہ کر دیا ہو تو آپ جب بھی اس کا دروازہ کھولیں گے تو بو تو آئے گی۔اب آپ دروازہ کھولتے ہی بند کر دیں کہ میں تو اندر نہیں جاتا بو ہے۔تو یوں وہ بو کبھی نہیں ختم ہو گی۔

ہمارے دل میں شیطان بلی نے گندے خیالات کی نجاست پھیلا رکھی ہے۔اب جب ہم مراقبے میں بیٹھ کر ذرا دل کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں تو اندر سے وہی جو بھر ہوتے ہیں، وہی مخلوق کی محبت وہی الٹی سیدھی باتیں، قطعاً گھبرانے کی بات

نہیں ۔اس کو برداشت کیجیے ۔اس پر بھی اجر ملے گا ۔

چنانچہ ہمارے مشائخ میں سے کسی بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت میں مراقبے میں بیٹھتا تو ہوں، مگر وسوسے بڑے آتے ہیں ۔انہوں نے جواب میں لکھا کہ اگر عام آدمی کو ایک اجر ملتا ہے تو آپ کو اللہ تعالیٰ دگنا اجر عطا فرمائیں گے ۔اس لیے کہ رکاوٹ زیادہ ہے ۔

حدیثِ پاک سے ثبوت ہے کہ جو بندہ اٹک اٹک کے قرآن مجید پڑھتا ہے اس کو زیادہ اجر مل جاتا ہے ۔یہ اس لیے کہ بیٹھنا جتنا مشکل ہوتا ہے اتنا ہی اس کو اجر زیادہ مل جاتا ہے ۔تو ابتداء میں بھلے آپ کو ادھر ادھر کے خیالات آئیں ۔مگر آپ بیٹھے رہیے، بیٹھے رہیے، بیٹھنے میں ہی راز پوشیدہ ہے، اس ذکر کی برکات کے کھلنے کا ۔

تلین جلود اور تلین قلوب:

اس پہلی کیفیت میں بیٹھنے کی عادت پڑ جائے تو اس کو کہتے ہیں جسم کا ذکر کے ساتھ مناسبت پا جانا ۔یہ پہلا قدم ہے، اس کے بعد پھر قلب کو مناسبت ہوتی ہے ۔ایک مثال سے ذرا سمجھیے :

جو لوگ نماز پڑھتے ہیں ان کے لیے التحیات میں بیٹھنا بڑا آسان بلکہ کئی دفعہ کرسی پر بیٹھنا مشکل لیکن نیچے بیٹھنا آسان ہوتا ہے ۔مگر جن لوگوں کو نماز کی عادت نہیں ہوتی یا جو کافر لوگ ہیں، ان کو اگر کہا جائے کہ آپ ذرا التحیات کی شکل میں بیٹھیں تو ان کے لیے یہ ایک مصیبت ہے ۔کئی لوگوں کو دیکھا گیا کہ اگر ان کو کبھی نیچے بیٹھنے کا موقع ملے تو پاؤں پھیلا کر بیٹھتے ہیں ۔کیوں؟ کہتے ہیں جی ہماری ٹانگیں ٹھیک ایسے مڑتی نہیں، جیسے مڑنی چاہئیں ۔

اس لیے کہ ان کے جسم کی مناسبت ہی نہیں اس پوزیشن میں بیٹھنے کے ساتھ ۔بالکل اسی طرح سالک کو بیٹھنے سے، پہلے تو جسمانی طور پر مناسبت ہوتی ہے

پھر اس کے دل کو ذکر کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾

یہاں ایک راز موجود ہے۔قلوب سے پہلے جلد کا تذکرہ کیا کہ یہ جو اللہ اللہ کرنے بیٹھتے ہیں، پہلے ان کی جلد نرم ہو جاتی ہے، بیٹھنے کی عادت پڑ جاتی ہے، بیٹھنا آسان ہو جاتا ہے۔آدھا گھنٹا، ایک گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ، دو گھنٹے بیٹھنا ان کو کوئی مشکل نہیں ہوتا۔یہ تلین جلود کا مرحلہ ہے۔

بلکہ سالکین کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ذرا ادھر ادھر سے وقت ملا، اللہ کی یاد میں، مراقبے میں بیٹھ جاتے ہیں۔جب مراقبے کے لیے طبیعت وقت تلاش کرنے لگ جائے، موقع تلاش کرنے لگ جائے تو آپ سمجھ لیں کہ مجھے اللہ نے اب تلین جلود کا مقام عطا کر دیا ہے۔اس کے بعد تلین قلوب ہے اور تلین قلوب جب ملتا ہے تو پھر انسان کے ذکر کی وہ کیفیت ہوتی ہے کہ ذکر کے بغیر اسے زندگی اچھی نہیں لگتی۔امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے۔

"اے اللہ! دن اچھا نہیں لگتا مگر تیری یاد کے ساتھ، اور رات اچھی نہیں لگتی مگر تجھ سے راز و نیاز کے ساتھ"

اللہ کی یاد انسان کی زندگی کا حاصل بن جاتی ہے تو ذکر رسوخ پکڑ جاتا ہے۔انسان کے قلب میں اور پھر باطن ڈھل جاتا ہے اور قلب کے اندر کی صفائی ہو جاتی ہے۔نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔ذکر پھر اپنا اثر دکھاتا ہے۔جو حضرات ذکر کر کے اپنے دل کے اندر استعداد پیدا کر لیتے ہیں، پھر قرآن مجید کی تلاوت سے ان کی باطنی ترقی اور زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

اس لیے ہمارے سلسلہ نقشبندیہ کے اسباق کو اگر آپ دیکھیے تو ابتداء میں

سارے ہی اسباق ذکر کے ہیں۔ پھر اس کے بعد تہلیل آتی ہے اور پھر اس کے بعد جا کر مراقبہ اور پھر جا کر کہیں قرآن اور حقیقتِ صلوٰۃ کے مرحلے آتے ہیں۔ تو ترتیب ہی مشائخ نے ایسی بنا دی۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں بھی نماز سے فائدہ ہو، تلاوت قرآن سے فائدہ ہو، تو ابتدا یہ ہے کہ ہم ذکر کو اچھی طرح کریں تاکہ ذکر کے ساتھ طبیعت کو مناسبت ہو جائے۔

ذکر کثیر کی تاثیر:

یہ بنیاد اس عاجز نے اس لیے باندھی تاکہ اچھی طرح یہ بات ذہن نشین ہو جائے کہ ہماری بیماریوں کا حل اس ذکر کی کثرت میں پوشیدہ ہے۔ ہم اگر ذکر کرتے بھی ہیں تو کثرت کے ساتھ نہیں کرتے۔ اس لیے فائدہ نہیں ہوتا۔ اس لیے پریشانی ہوتی ہے کہ اتنا عرصہ ہو گیا اور ابھی تک قلب کے اندر وہ نورانیت نہیں آئی جو آنی چاہیے تھی۔

تو اس کی بنیاد یہ ہے کہ ہم کثرت کے ساتھ ذکر کریں۔ جب طبیعت میں مناسبت ہو جائے گی تو پھر ایک وقت آئے گا کہ ہر وقت انسان کے دل میں اللہ کا دھیان رہے گا، توجہ رہے گی۔ پھر اگر کوئی بندہ اللہ کو بھلانا بھی چاہے گا تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کو بھلا نہیں سکے گا۔ ایسی کیفیت آجاتی ہے۔ بھلانا بھی چاہو تو بھلا نہیں سکو گے۔ ایسا وقت آجاتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے؟ دنیا میں کسی سے تعلق ہوتا ہے، لوگ نہیں بھول سکتے، اپنی باتوں کو۔ شاعر نے کہا:

روز کہتا ہوں بھول جاؤں اسے
اور روز یہ بات بھول جاتا ہوں

اگر دنیا کے تعلق کا یہ حال ہے تو پھر اللہ رب العزت کے تعلق کا کیا عالم ہو گا؟ اس لیے ہمارے مشائخ نے یہ فرمایا:

جودم غافل سودم کافر

''جو سانس غفلت میں گزر گیا ایسا ہی ہے جیسے وہ سانس کفر میں گزر گیا۔''

انہوں نے یہ چھوٹی سی بات نہیں کی۔ یہ کیفیت بندے کو حاصل ہو جاتی ہے۔ ہمارے مشائخ ایک لمحہ بھی اللہ رب العزت سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ ایسی کیفیت ہوتی تھی۔ اور یہی وہ کیفیت ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِہِمْ﴾

(اٰلِ عمران:۱۹۱)

''وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کو کھڑے، بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں۔''

ذکرِ کثیر کی یہ تاثیر کہ انسان کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہوئے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتا ہے تو قلب کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے۔ محنت ابتداء میں کرنی پڑتی ہے۔ مگر اللہ رب العزت آسانی فرما دیتے ہیں۔

یہ معاملہ ایسا ہی ہے کہ جیسے چھوٹا بچہ ہو اور والد اس کو کہے کہ بیٹا ذرا میری طرف چل کے آؤ۔ ایک، دو میٹر کے فاصلے پر کھڑا کر دیتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ذرا چل کے میرے پاس آؤ۔ تو والد صرف یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ بچہ کوشش کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ والد کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ گر بھی سکتا ہے، اور وہ تیار رہتا ہے، ذرا اس نے ڈگمگانا شروع کیا تو باپ گرنے نہیں دیتا فوراً اس کو سینے سے لگا لیتا ہے۔ تو پروردگارِ عالم بھی ہماری تمام کمزوریوں کو جانتے ہیں، مگر اس کے باوجود فرماتے ہیں، ذرا میرے پاس آؤ، آؤ میرے پاس۔ پروردگار بھی بندے کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ تو بندے کو چاہیے کہ اللہ رب العزت کی طرف سفر کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جائے، ڈٹ جائے، اگر اس راستے میں کوئی رکاوٹیں ہوں گی تو پروردگارِ عالم خود مہربانی فرما دیں گے۔

کرامات کی حیثیت:

ہمارے سلوک میں کرامات کو حاصل کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہمارے مشائخ نے فرمایا:

اگر بہواروی مکسے باشی
و بر آب روی خسِ باشی
دل بدست آور تا کسے باشی

"اگر تو ہوا میں اڑتا ہے تو مکھی کی مانند ہے، پانی پر چلتا ہے تو تو ایک تنکے کی مانند ہے، تو تُو دل کو قابو میں کر لے تا کہ کچھ تو بن جائے۔"

تو ہم نے اپنے دل پہ محنت کرنی ہے اور اپنے دل کو قابو کرنا ہے۔ پھر اس کی برکتیں دیکھیے گا۔

ذکر کی اہمیت کو سمجھیں:

تو ان اجتماعات کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہم ذکر کی اہمیت کو سمجھیں اور اپنی کمی کوتاہیوں کو دور کریں اور اگر کہیں ہم دوائی کم استعمال کر رہے ہیں تو دوائی کی ٹھیک مقدار استعمال کریں تا کہ فائدہ جلدی ہو جائے۔ اور اگر ہم نام کے سالک بھی بنے ہوئے ہیں اور عمل دیکھو تو ہالک بنے ہوئے ہیں تو پھر تو عمر بھی گزر جائے گی مگر کچھ نہیں بنے گا۔

شیخ الاسلام عبداللہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ پیر ہرات کے نام سے مشہور تھے۔ انہوں نے ایک عجیب بات لکھی، سونے کی سیاہی سے لکھنے والی بات ہے۔ فرماتے ہیں:

"کوئی نقشبندی ہے، کوئی چشتی ہے، کوئی قادری ہے، کوئی سہروردی ہے۔ اگر دل میں خدا کی یاد ہے تو تم سب کچھ ہو ورنہ کچھ بھی نہیں۔"

تو ذکر کی کثرت کرنی ہے۔اس سے پھر ہمارے راستے کھلیں گے اور اللہ رب العزت کی طرف سے خصوصی رحمتوں کا نزول ہوگا، برکتوں کا نزول ہوگا۔

ذکر کرنے میں حکمِ خدا کی بجا آوری ہے:

ہمارے اس سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں یہ جو آیت ہے،'' ﴿وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾'' اسی پر عمل ہے۔ دیکھیے اللہ رب العزت فرماتے ہیں۔ یہ امر کا صیغہ ہے۔'' واذکر'' حکم دیا جا رہا ہے۔ آج لوگ پوچھتے ہیں ذکر کیوں کرتے ہیں؟ مراقبہ کیوں کرتے ہیں؟ بھئی کیوں نہ کریں، اللہ رب العزت کا حکم ہے﴿وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ ہمارے رب کا نام کیا ہے؟

اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ تمہارے رب کا نام کیا ہے؟ تو ہم کیا نام لیں گے؟ اللہ۔ یہ اللہ جو ہے اس میں ...... یہ اللہ رب العزت کا اسم ذات کہا جاتا ہے۔ باقی صفاتی نام ہیں اور یہ ذاتی نام ہے۔ تو ارشاد فرمایا:

﴿وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ ''ذکر کر اپنے رب کے نام کا۔''

تو رب کا نام کیا ہے؟ اللہ۔ حکم ہے کہ رب کے نام کو یاد کرو، مگر یاد کرنے کی مقدار ہے۔ کتنا یاد کریں؟

﴿وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ (المزمل: ۸)

حتی کہ مخلوق سے تمہارا دل کٹ جائے اور تمہارا پروردگار سے دل جڑ جائے۔ اس حد تک ہم نے ذکر کو کرنا ہے۔ مخلوق سے انقطاع اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ وصل حاصل ہو جائے۔ اس حد تک ذکر کرنا ہے۔

مراقبہ کیوں کرتے ہیں؟

کہتے ہیں مراقبہ کیوں کرتے ہیں؟ دیکھیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ﴾ (الانفال:۲۰۵)

اپنے رب کا ذکر کر اپنے نفس میں، اپنے جی میں، اپنی سوچ میں، اپنے دھیان میں، اپنے من میں اپنے رب کو یاد کر۔ اب یہ حکمِ الٰہی ہے۔

کیسے کریں! اس کی تفصیل بھی بتا دی۔

تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً ''خفیہ اور پوشیدہ انداز سے''

معارف القرآن میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً'' کے الفاظ سے ذکرِ قلبی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ تو یہ حکمِ الٰہی ہے قرآن مجید میں۔ تم اللہ کا ذکر کرو اپنے من میں، اپنے جی میں، اپنے دل میں۔ ہم اپنے دل میں اللہ کو بیٹھ کر یاد کرتے ہیں۔ اس میں کون سی بات ہے جو سمجھ میں نہیں آتی۔ اور کئی مرتبہ تو بعض لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ان کو تو ذکر کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔ الحمد للہ

اللہ کے بندے ذکر کو کام ہی نہیں سمجھ رہے۔ جس امر کا پروردگار حکم فرما رہے ہیں اس کو کام ہی نہیں سمجھتے۔ تو یہ سوچ کا قصور ہے، ہمیں ان سے کیا گلہ کرنا ہے۔ بہر حال ہمیں تو اپنا مقصد پورا کرنا ہے۔ اور ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہماری اصلاح ہو جائے، ہمارا دل منور ہو جائے، ہمارا دل اللہ رب العزت کی محبت سے بھر جائے۔

ذکر کرنے کے دو خاص فائدے:

تو دو باتیں ہیں۔ ایک تو ذکر سے فکر کی گندگی دور ہوتی ہے اور دوسرا ذکر سے ذات (اللہ رب العزت) کی محبت نصیب ہوتی ہے۔

جس چیز کا جتنا زیادہ تذکرہ کرنا شروع کر دیں اس کا اتنا ہی زیادہ پانے کو جی چاہے گا۔ ایک دن کوئی تذکرہ کر دے کہ انناس کیسا پھل ہے؟ کوئی دوسرے دن تذکرہ کر دے، دو چار مرتبہ تذکرہ ہو تو ہر بندہ کہے گا کہ انناس کھانے کو جی چاہتا ہے۔ تو ذکر سے ذات کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے جو حضرات کثرت سے ذکر

کرتے ہیں پھر ان کو دونوں چیزیں نصیب ہو جاتی ہیں۔ فکر کی گندگی بھی دور ہو جاتی ہے اور اللہ رب العزت کی محبت سے دل بھی لبریز ہو جاتا ہے۔

مشائخِ عظام اور کثرتِ ذکر:

ہماری بیماریوں کا علاج ذکر کی کثرت میں ہے۔ ذکر کی کمی انسان کے لیے نقصان دہ ہے۔ تو ذکر کثرت کے ساتھ کریں۔ ہمارے مشائخ کتنا ذکر کرتے تھے؟

☆...... حضرت خواجہ فضل اللہ قریشی رحمۃ اللہ علیہ ان کے معمولات میں لکھا ہے کہ جب ہل چلاتے تھے زمین پر تو دل پر اللہ، اللہ کی ضرب بھی لگتی رہتی تھی۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب ہل ختم ہوئے میں نے گنا تو اسی ہزار مرتبہ اسم ذات کی ضرب لگائی تھی۔ اسی ہزار مرتبہ، اتنا ذکر کرتے تھے۔

☆...... حضرت مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ پر جب رات کو مراقبہ ہوتا تھا تو اس کی اختتامی دعا نہیں ہوتی تھی۔ کیا مطلب؟ کہ حضرت عشا کے بعد مراقبہ کے لیے تشریف فرما ہوتے اور جماعت ساری حلقہ بنا کے بیٹھ جاتی اس کے بعد اجازت تھی جب کوئی تھک جائے، بے شک وہ چلا جائے۔ ایک اٹھ کے جاتا، دوسرا جاتا، تیسرا جاتا حتی کے جاتے جاتے سب لوگ اٹھ کر چلے جاتے اور حضرت جب سر اٹھا کے دیکھتے کہ سب چلے گئے تہجد کا وقت تھا تو حضرت تہجد کی نیت باندھ لیا کرتے۔ یہی مراقبہ تھا اور یہی رات کا گزرنا تھا۔ مراقبے کی اختتامی دعا ہی نہیں ہوتی تھی۔ گھنٹوں مراقبہ کرتے تھے، گھنٹوں۔

مشائخ کی خلوت کی زندگی:

ہم نے اپنے مشائخ کو دیکھا ان کے معمولات منٹوں والے نہیں تھے، گھنٹوں مصلے پر بیٹھتے تھے، بیٹھے رہتے تھے۔ ہم نے تو ان کے دن کو دیکھا، کبھی اللہ ان کی

راتیں بھی دکھا دیتے تو کیا بات ہوتی۔ ان کی خلوت کے لمحات دیکھتے۔

عام لوگ چونکہ جلوت میں دیکھتے ہیں کہ او جی مشائخ بیٹھے ہیں۔ کھانا بھی اچھا مل رہا ہے اور خدمت بھی خوب ہو رہی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہی کچھ ہے، انہوں نے ان کی خلوت کی زندگی اور مجاہدوں کو نہیں دیکھا ہوتا کہ وہاں انہوں نے کتنا وقت گزارا ہوتا ہے۔

یاد رکھیں! جتنا انسان خلوت میں بیٹھ کے اللہ کو یاد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے نور کو اسی بندے کے چہرے پر سجا دیا کرتے ہیں۔ اس لیے تو اللہ والوں کے چہرے منور ہوتے ہیں۔ تو دل بھی منور ہوتے ہیں اور چہرے بھی منور ہوتے ہیں۔

ارشاد فرمایا:

((اَلَّذِیْنَ اِذَا رُؤُوْا ذُکِرَ اللّٰہَ))

''اللہ والے وہ ہوتے ہیں کہ جن کو دیکھو تو اللہ یاد آ جائے۔''

تو اس لیے ذکر کی کثرت ایک انتہائی اہم نکتہ ہے اور آپ حضرات دلوں میں یہ ارادے کیجیے کہ اگر ہم اپنے معمولات نہیں کرتے تو کریں گے، اور اگر کرتے ہیں، کم وقت دیتے ہیں تو اس کو زیادہ وقت دیں۔

مراقبہ، اصل تریاق ہے:

اکثر ہم اپنے احباب کے خطوط میں یہی شکوہ پڑھتے ہیں کہ حضرت درود شریف کی تسبیح بھی پڑھ لیتا ہوں، استغفار بھی پڑھ لیتا ہوں، بس مراقبہ نہیں ہوتا۔

بھئی! درود شریف اور استغفار یہ اوراد ہیں اور مراقبہ ہمارا سبق ہے۔ یہ اصل تریاق ہے۔

ڈاکٹر جب دوائی دیتا ہے تو اس میں اینٹی بائیوٹک گولی بھی ہوتی ہے، درد کی گولی بھی ہوتی ہے اور وٹامن بھی ہوتے ہیں۔ اس کو ایک نسخہ بنا کے دیتا ہے۔ اب وہ بندہ

جب گولی کھائے تو اس نے اینٹی بائیوٹک تو کھائی نہیں اور وٹامن کی گولی روز کھائے اور پھر کہے کہ بخار نہیں اتر رہا۔تو بخار کیسے اترے گا؟ اصل چیز تو وہ تھی جس نے بخار دور کرنا تھا۔

ہمارے گناہوں کے بخار کو دور کرنے کے لیے ذکرِ قلبی، مراقبہ، تریاق کی مانند ہے۔آزما لیجیے۔ یہ ایسی بات نہیں ہے کہ ہم اور آپ پہلی بار اس سفر کے لیے نکلے ہیں۔نہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جس پہ ہمارے مشائخ صدیوں سے چلے آرہے ہیں، صدیوں سے۔کروڑوں انسانوں نے اس راستے پر چل کر زندگی گزاری اور انہوں نے اللہ رب العزت کی محبت کو حاصل کیا۔

آج جیسے دو ضرب دو کوئی پوچھے، تو جواب دینے والا کہتا ہے پکی بات ہے چار ہے۔جس طرح اس عاجز کو یقین ہے کہ دو ضرب دو چار ہوتے ہیں۔اسی طرح اس عاجز کو اس سے بڑھ کے یقین ہے کہ جو بندہ پابندی سے ذکر کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں اپنا وصل ضرور نصیب فرمائیں گے۔اور یہ بات کرتے ہوئے اس عاجز کے پاؤں کے نیچے چٹان ہے۔ایسے یقین سے کہہ رہا ہوں۔اس لیے کہ ہم نے اپنے مشائخ کی زندگیوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔

یہ کوئی تجربہ نہیں ہو رہا کہ پہلی بار نئی دوائی مارکیٹ میں آئی ہے کہ آپ اس کا تجربہ کر رہے ہیں۔ یہ ایک پیٹنٹ دوائی ہے۔شروع سے لے کر اب تک۔

ذکر کب سے ہوتا آرہا ہے؟

نبی علیہ السلام کے دور سے لے کر اب تک ذکر ہوتا آرہا ہے اور ذکر سے اجر ملتا ہے۔اس کا اثر ہوتا ہے۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ذکر کرتے تھے باقاعدگی سے ذکر کرتے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین ان کی زندگی کے اوقات اللہ کی یاد میں گزرتے تھے۔ہاں۔ یہ اصطلاحات جو آج استعمال ہوتی ہیں یہ بعد کے

مشائخ نے متعین کیں۔ابوسید خراز رحمۃ اللہ علیہ تبع تابعین میں سے ہیں انہوں نے سب سے پہلے فنا اور بقاء کا لفظ استعمال کیا۔تو الفاظ کا استعمال تو چلو بعد میں سہی مگر کیفیات تو شروع سے ہوتی آرہی ہیں۔

احادیث میں آیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت بالکل خاموش بیٹھے رہتے تھے۔امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ یہ احادیث نقل کر کے پھر پوچھتے ہیں کہ کیا نبی علیہ السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا اتنی دیر خاموش رہنا غفلت کی وجہ سے تھا یا اللہ کی یاد کی وجہ سے تھا؟ تو یہ فقط خاموشی نہیں تھی بلکہ تدبر تھا، تفکر تھا اور یہ ذکر سے بھی اوپر کا مقام ہے۔تو اس لیے کہ ان حضرات کی زندگیوں میں بھی ذکر بہت زیادہ تھا اور اس وقت سے آج تک چلا آرہا ہے۔تو ہمیں ذکر کثرت کے ساتھ کرنا چاہیے۔

بابا من کی آنکھیں کھول:

اگر ہم چاہیں کہ ہمارا من صاف ہو جائے تو جب تک ہم ذکر نہیں کریں گے من کی آنکھیں نہیں کھلیں گی۔

بابا من کی آنکھیں کھول ، بابا من کی آنکھیں کھول
مطلب کی ہے دنیا ساری، مطلب کے ہیں سب سنساری
جگ میں تیرا کوہت کاری تن کا سارا زور لگا کے نام اللہ کا بول

(کوہت کاری یوں سمجھیں کہ مشکل کشا)

بابا من کی آنکھیں کھول ، بابا من کی آنکھیں کھول
دنیا ہے یہ ایک تماشا ، چاردنوں کی جھوٹی عاشہ

(عاشہ محبوبہ کو کہتے ہیں)

پل میں تولہ پل میں ماشہ
گیان ترازو ہاتھ میں لے کر تول سکے تو تول

تو ہم من کی آنکھیں کھول کے ذرا دیکھیں تو سہی کہ ہمیں کیا معارف نظر آتے ہیں۔

خلفائے راشدین اور دوامِ ذکر:

خلفائے راشدین کی زندگی کے بارے میں ایک بات لکھی ہے کہ ان کی زبان پر اکثر کچھ اذکار رہتے تھے۔ اور وہ ان کے اذکار ان کے مقامات کے مطابق تھے۔ یہ بھی ایک عجیب معرفت کی بات لکھی گئی۔ مثلاً

⊙..... سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ اٹھتے، بیٹھتے، ہر وقت لا الہ الا اللہ کا ورد کثرت کے ساتھ کرتے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کی مخلوق پر نظر اٹھتی ہی نہیں تھی، کاملاً ان کی توجہ اللہ رب العزت کی ذات کی طرف ہوتی تھی۔ ہر وقت لا الہ الا اللہ یہ نفی ہو رہی ہوتی تھی مخلوق کی۔ ذکر کر رہے ہوتے تھے۔ تو ان کا ذکر ہر وقت یہ ہوتا تھا۔ تہلیل لسانی اسی کو کہتے ہیں۔

⊙..... سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو کثرت سے اللہ اکبر کہنے کی عادت تھی چنانچہ اٹھتے بیٹھے، جب بھی کوئی بات ہوتی تھی تو کہتے اللہ اکبر کبیراً! یہ ان کی زبان پر زیادہ رہتا تھا۔ کیوں؟ کہ ان کی نظر جب بھی مخلوق پر پڑتی تھی تو مخلوق کی بجائے اللہ رب العزت کی عظمت کی طرف ان کا دھیان چلا جاتا تھا۔ ہر چیز میں اللہ کی بڑائی کو دیکھتے تھے۔ یہ ان کی طبیعت ہی ایسی تھی چنانچہ اللہ اکبر، اللہ اکبر کا ذکر کثرت کے ساتھ کرتے تھے۔

⊙..... سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کی زبان پر اکثر سبحان اللہ کا لفظ رہتا تھا۔ ہر وقت کہتے، بات بات پر سبحان اللہ، سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

آپ نے سنا ہوگا کہ فرشتے بھی سبحان اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اس وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اندر شرم وحیا نسبتاً بہت زیادہ تھی۔ ایسے باحیا تھے کہ اللہ کے فرشتے بھی ان سے حیا کیا کرتے تھے۔

خود نبی علیہ السلام تشریف فرما ہیں، بیٹھے ہیں اپنے گھر میں، حجرہ مبارک میں پنڈلی مبارک کا کچھ حصہ کھلا ہے تو جب اور صحابہؓ آتے ہیں تو آپ ﷺ لیٹے رہے اور جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تشریف لاتے ہیں تو آپ اٹھ کے بیٹھ گئے اور جسم مبارک کو ڈھانپ لیا۔ جب پوچھا گیا تو فرمایا کہ جب فرشتے ان سے حیا کرتے ہیں تو میں کیوں نہ حیا کروں۔ تو ان کو وہ مقام حاصل تھا۔

⊙ ...... سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کو الحمد للہ کہنے کا، ان کا تقیہ کلام الحمد للہ تھا۔ تو چاروں صحابہ رضی اللہ عنہم کا اپنا اپنا تقیہ کلام تھا اور یہ ان کے مدارج کے حساب سے تھا۔

ترتیبِ خلافت میں علما کا استدلال:

ہمارے اس سلسلے میں حضرت خواجہ نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا یہ جو طریقت ہے کیا یہ شریعت سے علیحدہ کوئی چیز ہے تو انہوں نے اس کا عجیب جواب دیا۔ فرمانے لگے نہیں، طریقت کا مقصود یہ ہے کہ جو کچھ اجمالی ہے وہ تفصیلی ہو جائے اور جو استدلالی ہے وہ کشفی ہو جائے۔ دو باتیں کہیں۔ تو علماء اسی چیز کو استدلال سے ثابت کر دیتے ہیں، مشائخ اسی چیز کو کشف میں دیکھ لیتے ہیں۔

چنانچہ مشائخ نے ان چاروں حضرات کے مقام کو دیکھا تو ان کو پتہ چلا کہ اللہ رب العزت نے ان کو ذکر کی مناسبت سے مقام دیا تھا۔ اور اسی مناسبت سے پھر ترتیب خلافت بھی آئی۔ لیکن علماء نے اس کو استدلال سے ثابت کر دیا چنانچہ انہوں نے ترتیب خلافت کی اپنی دلیلیں دیں۔

علما نے لکھا کہ نبی علیہ السلام نے جو فرمایا:

((خَیْرُ الْقُرُوْنِی قَرْنِی))

تو یہ جو قرنی کا لفظ ہے اس کے اندر ترتیب خلافت کا راز موجود ہے۔ مثلاً جتنے

خلفائے کرام ہیں، خلفائے راشدین ان کے نام کا آخری حرف اگر آپ لیتے جائیں تو قرنی کا لفظ بن جاتا ہے۔

صدیق کی 'ق' عمر کی 'ر' عثمان کی 'ن' اور علی کی 'ی' سب کے نام کا آخری حرف لیں تو کیا بن گیا؟ قرنی۔

تو فرماتے ہیں کہ قرنی کے لفظ میں ہی اللہ نے ان کی خلافت کی ترتیب بتا دی۔ اب انہوں نے اس کو دلائل سے ثابت کر دیا۔

بعض علما نے یہ دلیل دی کہ اگر ایک آدمی کے سسر ہوں اور ساتھ داماد ہو تو پھر فضیلت کس کے مقام کو حاصل ہے؟ سسر کو اس لیے کہ وہ والد کے درجے میں آ جاتا ہے۔ اور داماد بیٹے کے درجے میں آ جاتا ہے۔ تو سسر کو داماد پر فضیلت ہوتی ہے۔

لہٰذا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ یہ دونوں نبی علیہ السلام کے سسر تھے۔ اور باقی دو حضرات نبی علیہ السلام کے داماد تھے۔ اور ان میں سے بھی ایک عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دو بیٹیاں اور دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں ایک بیٹی۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تیسرے نمبر پر اور علی رضی اللہ عنہ چوتھے نمبر پر خلیفہ بنے۔

تو علما نے جن چیزوں کو استدلال سے ثابت کیا ہمارے مشائخ نے انہی چیزوں کو کشف کے ذریعے دیکھ کر بتا دیا۔ تو ان حضرات کا مقام ذکر کی مناسبت سے ہے۔ تو ذکر وہ حضرات بھی کرتے تھے، ہمیں بھی آج ذکر کی کثرت کے ساتھ کرنا ہے اور اسی میں ہماری تمام بیماریوں کا علاج موجود ہے۔

اللہ کی یاد میں سب کو بھول جائیں:

اتنا ذکر کیجیے کہ انسان ذکر کرتے کرتے اپنے آپ کو بھول جائے، بس اللہ کی یاد دل میں رہ جائے۔ حضرت خواجہ فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ ان کی خانقاہ پر سو، ڈیڑھ سو آدمی ہر وقت اللہ، اللہ سیکھنے کے لیے آتے تھے۔ صبح، دوپہر، شام ہر وقت وہیں ہوتے تھے

ان کے حالات میں لکھا ہے بلکہ ہم نے اپنے شیخ سے یہ بات سنی بھی کہ وہ فرماتے تھے کہ جب رات کو لوگ سوتے تھے تو تھوڑی دیر کے بعد کسی ایک سالک پر حال طاری ہوتا۔ اللہ، اللہ، اللہ کہتا تھا۔ وہ زور سے یہ کہنے لگ جاتے تو سب کی آنکھ کھل جاتی اور تھوڑی دیر بعد ان کی طبیعت ذرا سنبھلتی، تھوڑی دیر آنکھ لگتی پھر کسی نہ کسی کے اوپر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ...... اللہ، اللہ، اللہ۔ اسی طرح سوتے جاگتے میں ساری رات گزر جایا کرتی تھی۔

یہ کیفیت تھی ان حضرات کی۔ فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ دو بوڑھے تھے دونوں آپس میں قریب قریب بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک دوسرے کے بال کھینچتا، کپڑے کھینچتا، جھنجھوڑتا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ دوسرا پہلے والے کو اسی طرح کرتا۔ اب لوگ بڑے حیران کہ یہ لوگ سالک ہیں، بزرگ ہیں تو یہ مجمعے میں کیا ایک دوسرے کو مار رہے ہیں اور بال کھینچ رہے ہیں۔ تو ایک بندہ ان کے قریب ہوا کہ دیکھیں تو سہی کہ مسئلہ کیا ہے۔ جب قریب ہوا تو تب اس کو پتہ چلا کہ آپس میں ان کے درمیان الجھاؤ کا معاملہ پیش کیسے آیا۔

دونوں بیٹھے ہوئے تھے تو ایک نے دوسرے کو کہہ دیا کہ اللہ میڈا ہے اور دوسرے پر بھی محبت کا عجیب غلبہ تھا اس نے اس کو جھنجھوڑ کے کہا جی اللہ میڈا ہے۔ اب وہ اس کو جھنجھوڑتا ہے اللہ میڈا ہے اور وہ اس کو جھنجھوڑتا ہے اللہ میڈا ہے۔ آپ اندازہ لگائیے۔ کتنی محبت ان کے دلوں میں ہو گی کہ جو اللہ کی محبت میں اتنے مست تھے کہ ان کو بس یہی اچھا لگتا تھا کہ اللہ میڈا ہے۔

کاش! یہ کیفیت ہمیں بھی زندگی میں کبھی حاصل ہو جاتی۔ یہ محبت ایسی چیز مل جائے۔ یہ ہے ''اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ'' اللہ تعالیٰ کی شدید محبت دل میں۔ یہ بندے کو پھر مضطرب بنا دیتی ہے۔

محبتِ الٰہی میں اضطراب ضروری ہے؟

اسی لیے حضرت خواجہ معصوم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب تک سالک ذکر کے حصول میں مضطرب نہ ہو جائے تب تک کام نہیں بنتا۔

﴿حَتّٰی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْھِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ﴾

فرماتے ہیں کہ ایسی کیفیت ہو کہ زمین اس پر باوجود کشادگی کے تنگ ہو جائے اور یہ کیفیت ہو کہ ہر سالک محسوس کرے

﴿وَ ظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَا مِنَ اللّٰہِ اِلَّا اِلَیْہِ﴾ (التوبۃ:۱۸)

کہ اب میرا اللہ کے علاوہ کوئی ملجا اور ماوی نہیں۔ تو جب یہ کیفیت ہو جائے گی تو پھر دیکھنا کہ قلب کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کتنا آتا ہے۔ تو یہ ایک بنیاد ہے۔

ذکر کو کثرت سے کرنا، اگر یہ نسخہ سمجھ میں آ گیا تو پھر آپ تھوڑی دیر کے لیے اپنے شیخ کی صحبت میں بیٹھیں گے تو یہ تھوڑی دیر نہیں رہے گی اللہ اسی میں کام سنوار دیں گے۔

انتقال نسبت اور صفائی قلب:

جن حضرات کے آپ نے یہ واقعات پڑھے کہ اپنے شیخ کی خدمت میں آئے اور بس ایک دن میں ان کو نسبت مل گئی، یا ایک محفل میں نسبت مل گئی، ایک مہینے میں نسبت مل گئی تو یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے اپنے مقام پر رہ کر اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کیا۔ انہوں نے اپنے دل کو صاف کیا ہوا تھا۔ جب کوئی آئینہ صاف کر کے اپنے شیخ کے پاس آئے تو پھر اس میں نسبت کے انڈیلنے والی بات ہی پیچھے رہ گئی۔

ہم کیا کرتے ہیں کہ گندے برتن لے کر آ جاتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ ہم پر

بھی وہی توجہ کریں جو خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔ کہتے ہیں: پتہ نہیں یہ واقعہ کہاں سے پڑھ لیا، یہ نہیں بھولتا۔ ہاں! یہ واقعہ سو فیصد ٹھیک ہے لیکن جس پر توجہ ہوئی ذرا یہ تو سوچیے کہ اس بندے نے کتنی اخلاص سے خدمت کی ہوگی؟ اللہ تعالیٰ کو کتنا راضی کیا ہوگا؟ کہ آخر ایک ایسا وقت آیا قربانی دینے کے بعد کہ اس کے شیخ کے قلب کی یہ کیفیت ہوگئی، شیخ نے خود پوچھا بتا تو کیا چاہتا ہے، تو وہ کہنے لگا کہ جو آپ کی کیفیات ہیں، میں وہی چاہتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ان کو اپنے سینے سے لگایا تو اللہ رب العزت نے نسبت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل فرمادیا۔

ہاں! یہ نسبت منتقل ہوتی ہے لیکن اس کے لیے پھر برتن کو صاف کر کے آنا پڑتا ہے۔ حضرت خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ اپنے شیخ کی خدمت میں گئے تھے۔ چند دن کے بعد ان کو بھی نسبت مل گئی تھی۔ تو یہ وہ حضرات تھے جو اپنے مقام پر رہ کر کثرت کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔

آج کے سالکین کی حالتِ زار:

آج ہمارا مسئلہ یہ بنتا ہے کہ ہم اپنی جگہ اوراد و وظائف اور ذکر کی پابندی نہیں کرتے اور اگر کبھی شیخ کی صحبت میں جانا بھی ہوتا ہے تو وہاں جا کر توقعات کرتے ہیں کہ بس جی ان کے پاس کوئی مشک ہونا چاہیے اور اس کے اندر ڈبکی لگوائیں اور اللہ کے رنگ میں رنگ کے ہمیں واپس بھیج دیں۔

آتے بعد میں ہیں اور کہتے پہلے ہیں کہ حضرت میں نے بڑے مشائخ کو دیکھا۔ فلاں کے پاس بھی گیا، فلاں کے پاس بھی گیا، فلاں کے پاس، احسان چڑھاتے ہیں۔ حضرت میں نے بڑے مشائخ کو دیکھا ہے لیکن آپ سے بیعت کی ہے۔ بس اب میں حاضر ہوا ہوں، ذکر و مراقبہ تو ہوتا نہیں بس آپ ہی توجہ فرمادیں۔ ویسے میں

نے جلدی گھر جانا ہے۔اور پھر تیسری بات یہ بھی کرتے ہیں کہ بیوی بھی کوئی بات نہیں مانتی اس کے لیے بھی کچھ بنا کے دے دیں کہ میں نے جلدی گھر جانا ہے۔

اگر سالک اور پیر کے درمیان اس طرح ہوگا تو پھر اصلاح کیسے ہوگی؟ تو اس لیے اجتماعات کا مقصد صرف وعظ ونصیحت کر کے اور دھواں دار تقریریں کر کے بھیجنا نہیں ہوتا۔ بلکہ بات ذہن میں بٹھانی ہوتی ہے، ذہن سازی کرنی ہوتی ہے، کچھ سمجھانا ہوتا ہے۔

اگر ہم نے آج یہ بات سمجھ لی کہ ہم اپنا کھانا بھی چھوڑ دیں گے اور مراقبے کا ناغہ نہیں کریں گے تو بس آپ سمجھ لیں کہ ایک بنیاد بن گئی تو پھر اس کی برکت، محبت تجھ کو آداب محبت خود سکھا دے گی۔ پھر آپ دیکھئے گا کہ آپ اس راستے پر کتنی تیزی کے ساتھ چلتے ہیں۔ یہ بہت آسان راستہ ہے۔ مشکل نہیں ہے۔ الحمدللہ۔

کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہیں کہ ہر بندہ نہیں کر سکتا۔ تو ہمارے مشائخ نے الحمدللہ اللہ رب العزت سے ایسا راستہ مانگا کہ جس پر چلنا ہر بندے کے لیے بہت آسان ہے۔ اللہ رب العزت کا احسان سمجھئے کہ پروردگار عالم نے ہمیں اس جگہ ان بڑے حضرات کی خدمت میں حاضری کی توفیق نصیب فرمائی۔

مشائخ سے توجہات لینے کا طریقہ:

اب ہم ان توجہات سے فائدہ تبھی پائیں گے جب ہم اپنے قلب کی توجہ ان حضرات کی طرف رکھیں گے۔ جب صحبت میں ہوں تو رابطہ شیخ، اپنے آپ کو خالی سمجھیں۔

یوں سمجھیں کہ اوپر سے فیض آرہا ہے۔ نبی علیہ السلام کے قلب مبارک میں اور مشائخ کے قلب سے ہوتا ہوا میرے شیخ کے قلب سے فیض میرے قلب میں آرہا ہے۔ یہ رابطہ قلبی ہے جب سامنے ہوں اور جب سامنے نہیں تو ذکر قلبی۔ اگر یہ

دو باتیں سمجھ میں آ گئیں تو پھر دیکھئے اس کی برکتیں کیسے ملتی ہیں۔

ہمارے مشائخ کی ایک ایک محفل بندے کے دل کو دھو دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔لیکن دل کا قبلہ درست ہونا چاہیے۔اگر بارش موسلا دھار ہو لیکن ایک پیالہ ہی الٹا ہو تو اس میں تو کوئی قطرہ پانی نہیں آئے گا۔تو یہ بارش کا قصور نہیں یہ اس پیالے کا قصور ہے جس کا رخ ٹھیک نہیں ہے۔ہم ایسی جگہوں پر آئیں تو دل کے پیالے کو ٹھیک کر کے بیٹھیں۔متوجہ ہو کر بیٹھیں۔

﴿اِنَّ فِي ذَالِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ﴾

''بے شک اس میں نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل ہیں''

ان باتوں میں نصیحت ہے ان کے لیے جن کے دل ہوں یعنی ان کے دل متوجہ ہوں۔

﴿اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾ (ق:۳۷)

ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھیں اور نگاہیں شیخ کے چہرے کی طرف ہوں، کان متوجہ ہوں کہ کیا فرماتے ہیں دل حاضر ہوں۔پھر دیکھئے کہ آپ کو ایک محفل میں کتنا فیض ملتا ہے۔آداب کے ساتھ تھوڑا بھی وقت گزاریں گے تو زیادہ فائدے کا سبب بن جائے گا۔

تو یہ بنیادی چند باتیں تھیں جو اس عاجز نے آپ کے سامنے عرض کر دیں۔مقصود تو اپنا سبق پکا کرنا تھا۔اللہ تعالیٰ اس عاجز کو بھی ان تمام باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرما دے۔اور آپ حضرات بھی اگر ان پر پابندی فرمائیں گے تو انشاء اللہ ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔فائدہ ضرور ہوتا ہے۔تو ذکر کی کثرت کرنی پڑتی ہے۔ذکر کر کے پھر وہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ پھر انسان اپنے رب کی یاد میں لگ جاتا ہے۔اللہ کے نام کو بھولتا ہی نہیں۔

حضرت منے شاہ اور ذکرِ الٰہی:

حضرت قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا سنگِ بنیاد رکھا جانے لگا تو مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت یہ اعلان فرمایا کہ آج سنگِ بنیاد میں ایک ایسی ہستی سے رکھواؤں گا کہ جنہوں نے کبیرہ گناہ تو کیا کرنا، کرنے کا ارادہ ہی دل میں کبھی نہیں کیا۔ تو پھر لوگوں نے دیکھا:

مولانا مظفر حسین کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں ''منے شاہ'' کے نام سے مشہور تھے۔ ظاہر میں تو قد چھوٹا تھا مگر اللہ کے ہاں قد بہت بڑا تھا اور گھاس کاٹتے تھے۔ اور گھاس کاٹ کر بیچ کے اپنا وقت گزارتے تھے۔ ظاہر میں حیثیت اتنی معمولی سی تھی مگر بڑے متقی و پرہیزگار تھے۔

ان کے بارے میں آتا ہے کہ سارا سال ایک ایک پیسہ جمع کر کے اتنا پیسہ جمع کرتے کہ دارالعلوم کے اساتذہ کی سال میں ایک مرتبہ دعوت کرتے۔ اساتذہ خود لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ہمیں سارا سال ان کی دعوت کا انتظار رہتا تھا۔ جب ہم ان کی دعوت کھا کے آتے تھے تو چالیس دن تک نماز کی حضوری میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ سبحان اللہ!

چالیس دن تک ہم نماز میں حضوری کا اضافہ پاتے، جب ان کی دعوت کھا کے آتے۔ ان سے سنگ بنیاد رکھوایا گیا اور ان کی کیا کیفیت تھی؟ ان کے ذکر کی یہ حالت تھی کہ ان کا داماد تھا اس کا نام تھا ''اللہ بندہ'' وہ سامنے سے گزرا۔ ارے میاں تم کون ہو؟ حضرت میں اللہ بندہ ہوں۔ ارے سبھی اللہ کے بندے ہیں، تم کون ہو؟ حضرت میں آپ کا داماد اللہ بندہ ہوں۔ اچھا، اچھا، اچھا۔ پھر کچھ دیر بعد سامنے آتا، ارے میاں تم کون ہو؟ حضرت میں اللہ بندہ ہوں۔ ارے، سبھی اللہ کے بندے ہیں تم کون ہو؟ حضرت میں آپ کا داماد اللہ بندہ ہوں۔ اچھا، اچھا، اچھا۔

دو سال وہ داماد آپ کی خدمت میں رہا اور دو سال میں اس کا نام یاد نہ ہوا۔ غیر کا نام ایسے محو ہو گیا تھا کہ ماسوا کہ قلب میں میں دوسرے کا نام آتا ہی نہیں تھا۔

یہ ذکر کی کیفیت تھی ہمارے مشائخ کی۔ اللہ کا نام رچ بس گیا تھا ان کے دلوں میں۔

ہم بھی ایسا ذکر کریں:

اسی طرح ہم بھی ذکر کی کثرت کریں۔ تا کہ ہمارے قلب میں اللہ کا نام رچ بس جائے، اتر جائے اللہ کا نام۔ ایسی کیفیت ہو کہ:

یاد میں تیری سب کو بھلا دوں کوئی نہ مجھ کو یاد رہے
تجھ پر سب گھر بار لٹا دوں خانہ دل آباد رہے
سب خوشیوں کو آگ لگا دوں غم سے ترے دل شاد رہے
سب کو نظر سے اپنی گرا دوں تجھ سے فقط فریاد رہے
اب تو رہے بس تا دم آخر ورد زباں اے میرے الہ
لا الہ الا اللہ ، لا الہ الا اللہ

یہ کیفیت ہو جائے اللہ تعالیٰ سے ہم ایسا دل مانگیں۔

اللہ وہ دل دے جو تیرے عشق کا گھر ہو
دائمی رحمت کی اس پہ تیری نظر ہو
دل دے کہ تیرے عشق میں یہ حال ہو اس کا
محشر کا اگر شور ہو تو بھی نہ اس کی خبر ہو

ایسے اللہ رب العزت کی ہمارے دل میں یاد آ جائے کہ ہمیں ہر چیز سے غافل کر دے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی یاد عطا فرما دیں۔ (آمین ثم آمین)

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾

تصوف و سلوک

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

اقتباس

ایک تھیں تعلیماتِ نبوی اور ایک تھیں کیفیاتِ نبوی۔ تعلیماتِ نبوی ﷺ کو ''علم شرائع'' (شرع کا علم) کہتے ہیں۔ اور کیفیاتِ نبوی ﷺ کو ''علم الاحسان'' کہتے ہیں۔ اسی علم الاحسان کا دوسرا نام تصوف ہے۔ بھئی! ہم اگر اس کو تصوف کہتے ہیں اور آپ کو اس نام سے چڑ ہے تو آپ اس کو تزکیہ کہہ دیں یا علم الاحسان کہہ لیں، یہ تو قرآن و حدیث کے الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کا تذکرہ قرآن مجید میں یوں فرماتے ہیں:

﴿وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (ال عمران:۱۳۴)

''اور اللہ تعالیٰ محسنین سے محبت فرماتے ہیں''

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

تصوف وسلوک

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ o بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o
﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ o وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ o
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّم

ہر گل رنگ و بو دیگر است:

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اَلنَّاسُ مَعَادِنٌ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ

''انسان کانوں کی مانند ہیں، جیسے سونے اور چاندی کی کانیں۔''

کسی انسان میں اللہ نے کوئی صفت رکھی ہے اور کسی میں کوئی۔ اگر انسانوں کی زندگیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں مختلف صفات نظر آئیں گیں۔

ہر گلِ رنگ و بو دیگر است

''ہر پھول کا رنگ اور ہر پھول کی خوش بو جدا ہوتی ہے۔''

کسی میں کوئی خیر کی بات ہوگی اور کسی میں کوئی شر کی بات ہوگی۔ حتی کہ جس کو ہم بہت ہی برا اور فاسق و فاجر کہتے ہیں ان کی زندگیوں کو قریب سے دیکھیں تو ان میں بھی آپ کو کوئی نہ کوئی اچھی باتیں نظر آ جائیں گی۔ گویا انسانوں کی زندگیوں کی عقلی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔

خیر اور شر کا ماحول:

مخلوقات میں سے

......جو سراپا خیر ہیں، وہ فرشتے ہیں۔

......جو سراپا شر ہے، وہ شیطان ہے، اور

......جو خیر اور شر کا مجموعہ ہے، وہ حضرت انسان ہے۔

یعنی ہر انسان کے اندر خیر بھی ہے اور شر بھی۔ فرق یہ ہے کہ انسان اگر خیر کے ماحول میں رہے تو اس پر خیر غالب آ جاتی ہے اور شر کے ماحول میں رہے تو اس پر شر غالب آ جاتا ہے۔ دنیا کے نیک ترین کو اگر برا ماحول مل جائے تو اس کے پھسلنے کے مواقع موجود ہوتے ہیں۔ اور اگر دنیا کے بدترین انسان کو اچھا ماحول مل جائے تو اس کے سنورنے کے مواقع موجود ہوتے ہیں۔ تو ماحول کا انسان پر اثر ہوتا ہے۔

ماحول کے اثرات:

علما نے لکھا ہے کہ جو لوگ مختلف جانور پالتے ہیں ان پر ان جانوروں کا بھی اثر ہوتا ہے۔ مثلاً

......جو لوگ گھوڑے پالتے ہیں ان کے اندر شجاعت ہوتی ہے۔

......جو اونٹ پالتے ہیں ان کے اندر ہٹ دھرمی ہوتی ہے۔

......جو بکریاں پالتے ہیں ان کے اندر عاجزی ہوتی ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر جانوروں کے ساتھ رہنے پر انسان کے اوپر اثرات مرتب ہو جاتے ہیں تو پھر نیک صحبت میں رہنے سے نیک اثرات کیوں مرتب نہیں ہوں گے۔ اسی لیے کہتے ہیں:

اَلصُّحبَةُ مُؤَثِّرَةٌ "صحبت کے اثرات ہوتے ہیں"

اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو نیک ماحول میں رکھے۔ نیک دوست بنائے تاکہ وہ اس کو نیکی کے راستے سے ہٹنے نہ دیں، بھٹکنے نہ دیں۔ اگر وہ بھٹکنا بھی چاہے تو وہ اس کو نیکی کی طرف کھینچیں۔ آج کل نوجوان کہتے ہیں: میرے دوست برے ہیں، میں نہیں ہوں۔ وہ برے کام کرتے ہیں، میں تو صرف دیکھتا ہوں، میں کرتا کچھ نہیں۔ جب بھی کوئی نوجوان یہ بات کرے تو آپ سو فیصد یہ سمجھ لیں کہ یہ بڑے یقین سے جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ خود برے کام نہ کرے۔ دوست ہی سے تو پہچان ہوتی ہے۔ اگر اچھے دوست ہوں گے تو بندہ خود بھی اچھا ہوگا اور اگر برے دوست ہوں گے تو وہ خود بھی برا ہوگا۔ تو انسان جس ماحول میں پرورش پائے اس پر اس ماحول کے اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں۔ نیکی کے ماحول میں رہنے والا اللہ رب العزت کا مقبول بندہ بن جاتا ہے اور برائی کی زندگی گزارنے والا اور برے ماحول میں رہنے والا اللہ رب العزت کا ناپسندیدہ بندہ بن جاتا ہے۔

جسمانی اور روحانی بیماریاں:

انسان کے جسم میں جسمانی بیماریاں بھی ہوتی ہیں اور روحانی بیماریاں بھی ہوتی ہیں۔ جسمانی بیماریاں تو وہ ہیں جو آپ جانتے ہیں۔ جیسے ایک بندے کو بلڈ پریشر ہے، شوگر ہے، السر ہے۔ یہ تو ڈاکٹروں کی ٹرمینالوجی کی بیماریاں ہیں۔ اسی طرح اطبأ کی زبان میں انشقاق الشفتین، رمد چشم، شقیقہ، خناق، قبض، قولنج، وجع المفاصل، عرق النساء، مختلف بیماریوں کے نام ہیں۔

اسی طرح روحانی بیماریوں کے بھی نام ہیں۔ جیسے بغض، حسد، کینہ، تکبر، ریا، کذب، شہوت، کسلان فی الصلوٰۃ، ترک الصوم والزکوٰۃ اور نفاق۔ یہ سب کی سب باطن کی بیماریاں ہیں۔

جسمانی اور روحانی معالج:

جیسے ظاہر کی بیماری کی صورت میں ہم اطبأ اور ڈاکٹروں کی طرف جاتے ہیں، اسی طرح باطن کی بیماریوں کے لیے بھی باطنی اطبأ کی طرف جانا چاہیے۔ اللہ نے باطنی بیماریوں کے لیے بھی اطبأ بنائے ہیں۔ ان کو مشائخ، علما اور صلحا کہا جاتا ہے۔ اور جو ظاہری بیماریوں کو ڈیل کرنے والے ہیں ان کو حکما، اطبا، سرجن، ڈاکٹر اور کمپوڈر کہتے ہیں۔

جسمانی اور روحانی بیماریوں پر کتب:

ظاہری بیماریوں کے لیے اطبأ نے کتابیں لکھی ہیں اور ان کی تفصیلات درج کیں۔ مثال کے طور پر: میزان الطب، طب اکبر، شرح اسباب، قانونچہ، منہاج الاطبہ وغیرہ۔ اسی طرح باطنی بیماریوں کے علاج کے لیے بھی کتابیں موجود ہیں۔ سب سے بڑی کتاب اللہ کا قرآن عظیم الشان ہے۔ پھر اس کی اگلی تفصیلات بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، ابوداؤد شریف، نسائی، مؤطین، اخلاق الصالحین وغیرہ۔ یہ سب کتابیں انسانوں کی باطنی بیماریوں کو ختم کرنے کے طریقے بتاتی ہیں۔

معالج کی ضرورت واہمیت:

جسمانی بیماریوں کے لیے کوئی بھی آدمی صرف کتابوں تک ہی محدود نہیں رہتا۔ وہ نہیں سوچتا کہ جی! مجھے بلڈ پریشر ہے اور میں کتاب سے پڑھ کر بلڈ پریشر کی گولی لے لوں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ کوئی بھی بندہ کتاب پڑھ کر اپنا علاج نہیں کرتا۔ وہ تو ایک سپیشلسٹ سے دوسرے اسپیشلسٹ کے پاس بھاگتا ہے۔ بلکہ اگر ایک اسپیشلسٹ بتا دے کہ یہ بیماری ہے تو پھر وہ کہتا ہے کہ میں ایک اور اسپیشلسٹ

سے ویری فائی کرواتا ہوں۔اسی طرح روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے بھی فقط کتابیں کام نہیں آئیں گی۔ان کے لیے بھی کسی نہ کسی طبیب کی ضرورت پڑتی ہے۔شیطان ایک بڑا خوبصورت دھوکہ دیتا ہے کہ تمہیں کیا ضرورت ہے کسی سے اپنی بات کرنے کی؟ اپنی اصلاح خود کرلو۔جو اپنا علاج خود کرے گا،بس وہ جلدی مرے گا۔بلکہ ہم نے تو دیکھا ہے کہ جب ڈاکٹر بیمار ہوتا ہے تو وہ فوراً دوسرے ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ڈاکٹر اپنا علاج خود نہیں کرتے۔حالانکہ ان کے اپنے پاس بھی نالج ہوتا ہے۔مگر پھر بھی دوسرے ڈاکٹر کو چیک کرواتے ہیں۔اس سے رائے لیتے ہیں یہ مجھے کیا بیماری ہے؟ اپنے بارے میں انسان کی اسیسمنٹ (تشخیص) ٹھیک نہیں ہوتی۔نفس اپنی باتوں کو مزین کر کے پیش کرتا ہے۔انسان کو اپنی برائی برائی ہی نہیں لگتی اور اپنی چھوٹی سی نیکی بہت بڑی لگتی ہے۔اس لیے انسان اپنے بارے میں نہ تو اپنی ٹھیک رائے قائم کرسکتا ہے اور نہ ہی اپنا علاج خود کرسکتا ہے۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ ایک صاحب کا بیٹا بیمار ہوگیا۔اس کا پیٹ خراب ہو گیا۔لوز موشن لگ گئے۔بیوی نے بہت کہا کہ اس کا علاج کرواؤ،ڈاکٹر کو دکھاؤ اور اس کو دوائی لاکر دو۔اس بیچارے کے پاس پیسے کم تھے۔اس نے سوچا میں نے جو ڈاکٹر کو سو روپیہ فیس دینی ہے تو کیوں نہ میں اس پیسے سے دوائی خرید لوں۔کیونکہ یہ ایک سادہ سی بیماری ہے۔چنانچہ وہ کسی میڈیکل سٹور پر گیا اور اپنے ذہن میں سوچتا رہا کہ بیماری کیا ہے۔وہ یہی سوچتا رہا کہ ایک ہوتی ہے قبض اور ایک ہوتی ہے لوز موشن۔یہ ایک دوسرے کے متضاد بیماریاں ہیں۔اب بچے کو لوز موشن لگے ہوئے ہیں،لہٰذا اگر اس کو لوز موشن لگے ہوئے ہیں اور اگر اس کو قبض کی دوائی دے دیں تو ٹھیک ہونے کی بجائے اور زیادہ پریشان کن حالت ہو جائے گی۔اس نے میڈیکل سٹور پر جاکر کہا: جی! مجھے قبض کی دوا چاہیے۔اس نے دے دی۔جب دوائی دی تو

بچے کی حالت اور خراب ہوگئی۔ وہ تو مرتے مرتے بچا۔ بیوی سمجھدار تھی۔ وہ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ خاوند بھی ساتھ گیا، بچہ تو خیر بچ گیا۔ تاہم ڈاکٹر نے پوچھا: تم نے اسے کون سی دوائی دی؟ وہ کہنے لگا: میں نے سوچا اس کو لوز لوشن لگے ہوئے ہیں، لہٰذا اگر قبض کی دوا کھالے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے اسے قبض کی دوا دے دی۔ ڈاکٹر نے کہا: عقل کے اندھے! ہماری زبان میں قبض کی دوا کا مطلب ہے، قبض ہے، اسے کھولنے کی دوا دو۔ اس دوائی نے تو الٹا پیٹ لوز کر دیا ہے۔ جبکہ تمہارے بیٹے کو پہلے ہی موشن لگے ہوئے تھے۔ انسان اگر اپنی بیماری کا علاج کرے تو ایسا ہی علاج کرتا ہے ؎

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

نفس تو یہی کہے گا: بھئی! خواہش پوری کر لو، سب ٹھیک ہے، مسئلہ ہی کوئی نہیں۔ اس لیے معالج کی ضرورت پیش آتی ہے۔

جسمانی اور روحانی علاج کے طریقہ ہائے کار:

جسمانی علاج کے لیے کئی طریقہ کار ہیں۔ ایک کو ہم کہتے ہیں: یونانی طب۔ ایک کو کہتے ہیں: ایلوپیتھک۔ ایک کو کہتے ہیں: ہومیوپیتھک۔ آج کل ایک نیا طریقہ علاج بھی آ گیا ہے اس کو کہتے ہیں: آکوپنکچر۔ یہ عجیب طریقہ ہے۔ ایک انچ، دو انچ، تین انچ کی لمبی لمبی سوئیاں بندے کے اندر چبھو دیتے ہیں اور بیماری کا علاج ہو جاتا ہے۔ ایک بندے کو نیند نہیں آتی ۔ اس کو ڈاکٹر صاحب ایک سوئی چبھوئیں گے اور وہ ایسے سوئے گا جیسے نشے کی دوا پی کے سو رہا ہے۔

جس کا جی چاہے وہ ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، طب اور آکوپنکچرنگ میں سے جو مرضی طریقہ علاج اختیار کرے۔ ایسے ہی اللہ رب العزت نے روحانی بیماریوں کے علاج

کے بھی مختلف طریقے بنا رکھے ہیں۔ ایک روحانی طریقہ کار ہے نقشبندیہ، ایک ہے چشتیہ، ایک ہے قادریہ اور ایک ہے سہروردیہ۔ کہیں ذکر خفی سے علاج کرتے ہیں اور کہیں ذکر جہر سے علاج کرتے ہیں۔ انداز مختلف ہیں مگر طریقے سارے ٹھیک ہیں۔ ان طریقوں سے انسان کو واقعی روحانی طور پر صحت ملتی ہے۔

جسمانی اور روحانی غذائیں:

اس کے بعد اگر انسان اچھی غذا استعمال کرے تو اس کی صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ بیمار آدمی کو گندم کی روٹی دیتے ہیں، پھر جو کی روٹی دیتے ہیں، دودھ پلاتے ہیں، جوس پلاتے ہیں۔ جسمانی غذائی استعمال کروائی جاتی ہیں۔ ایسے ہی انسان کی روحانی خوراک انوارات، فیوضات، تجلیات اور سکینہ ہیں جو انسان کی روح کو ٹھیک کر دیتی ہیں۔

دستور یہ ہے کہ انسان کا جسم مٹی سے بنا اور اس کی خوراک بھی مٹی سے نکلی۔ اور انسان کی روح اوپر سے آئی اور اللہ نے اس غذا کا انتظام بھی اوپر سے کیا۔ اس لیے ایسی محفلوں میں بیٹھنا جن میں انوارات اور تجلیات برستی ہوں اور رحمتیں برستی ہوں، وہاں روحانی بیماریوں کا علاج خود بخود ہو جاتا ہے۔

صحیح علاج نہ کروانے کا نقصان:

اگر جسمانی بیماریوں کا صحیح طرح علاج نہ کروائیں تو بندے کی جان گئی اور اگر روحانی بیماریوں کا صحیح علاج نہ کروائیں تو بندے کا ایمان گیا۔ کتنے ایسے لوگ ہیں کہ ان کا فسق اتنا بڑھتا ہے کہ وہ ایسی باتیں کر دیتے ہیں کہ ایمان سے خالی ہو جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم انجینئرز کی میٹنگ میں بیٹھے تھے۔ ایک انجینئر نے اپنے ورکر کو

بلایا۔فورمین صاحب کو۔ پھر اس فورمین نے ایسی بات کی کہ توبہ توبہ۔اس نے ایسی خطرناک بات کی کہ میں تو کانپ ہی گیا۔ وہ فورمین خدا کے بارے میں کفریہ بات کرنے لگا۔معاذ اللہ......نقلِ کفر کفر نہ باشد......وہ کہنے لگا:

''اگے تے پنجی منٹی سنداسی، پتہ نئیں کتھے چلا گیا سندا ای نئیں، اسیں وی نمازاں پڑھنیاں چھڈ دتیاں نیں۔''

سوچیں کے ایسے بندے کا ایمان کہاں سلامت رہا۔اس لیے جسمانی علاج سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ انسان اپنا روحانی علاج کروائے۔

جسمانی اور روحانی بیماریوں کی علامات:

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ جسمانی بیماریوں کی علامات ہوتی ہیں۔مثلاً:

⊙......جس بندے کو ہائی بلڈ پریشر کی بیماری ہے وہ محسوس کرے گا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے، چہرہ پھول رہا ہے، کانوں میں کچھ محسوس ہوگا۔اس کو ڈاکٹر کہے گا: جی! آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہو چکا ہے۔

⊙......ایک بندے کو بار بار بیت الخلاء میں جانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔یہ بھی ایک بیماری کی علامت ہے۔چنانچہ ڈاکٹر کہے گا: جی! آپ کو شوگر ہے۔

⊙......ایک بندہ چند منٹ چلتا ہے اور سانس پھول جاتا ہے۔ڈاکٹر اسے کہے گا: جی! آپ کو دل کی بیماری ہے۔

ان علامات کی بنیاد پر جب انسان جسمانی طور پر بیمار ہوتا ہے اس کے لیے کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔اسی طرح روحانی بیماریوں کی علامت یہ ہے کہ جو انسان روحانی طور پر بیمار ہوتا ہے اس کے لیے اعمال کرنے مشکل ہو جاتے ہیں۔نماز کے لیے اس کا دل نہیں کرتا۔تلاوت نہیں ہو سکتی۔تہجد کے لیے آنکھ ہی نہیں کھلتی۔سچ بولنا مشکل ہو جاتا ہے۔اپنی غلطی کو تسلیم کرنا مصیبت نظر آتا ہے۔

میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

سمجھا کے دیکھو، وہ آگے سے گلے پڑ جائے گا۔ بہن کو کہتا ہے: نماز پڑھ۔ وہ کہے گی: جا! پہلے اپنی بیوی کو سمجھا۔ یہ تسلیم نہیں کرے گی کہ ہاں میں نماز نہیں پڑھتی۔ اپنے ہی بات نہیں مانتے۔ اس لیے انسان اپنی جسمانی بیماریوں سے زیادہ اپنی روحانی بیماریوں کے علاج پر توجہ دے۔

''سلسلہ'' کس کو کہتے ہیں؟

یہ جو ''سلسلہ'' کہا جاتا ہے، یہ ان روحانی طبیبوں کی ایک چین (زنجیر) ہے جو روحانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ ہمارے طبیبِ اعظم، مرشدِ اعظم اور معلمِ اعظم حضرت محمد مصطفٰے احمد مجتبٰے صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان سے روحانی بیماریوں کا علاج صحابہ نے سیکھا۔ پہلے خود مریض تھے لیکن جب اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو علاج ہوگیا۔ اور علاج بھی کیسا ہوا؟ ۔

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
وہ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

روحانی طور پر مردہ لوگ آتے تھے اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر واپس جاتے تھے۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم سے تابعین نے اپنا روحانی علاج کروایا۔ پھر ان سے تبع تابعین نے کروایا اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہ سلسلہ ہمارے پاس آج تک محفوظ ہے۔ لوگ اپنے نسب کو محفوظ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں: جی! ہم حسنی حسینی سید ہیں اور پھر اس سلسلے کو نبی علیہ السلام سے شروع کر کے نیچے تک لے کے آتے ہیں۔ جو علوی حضرات ہیں وہ کہتے ہیں: جی! ہم محمد بن حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہیں۔

اسی طرح ہمارے روحانی سلسلہ میں ہمارے تمام مشائخ کے نام موجود ہیں کہ کن حضرات نے کن سے دین سیکھا؟ پھر ان سے کن حضرات نے دین سیکھا؟

بے استاد بے بنیاد:

بھئی! دین تو سیکھنے سے ہی آتا ہے۔ خود بخود تو نہیں آ جاتا۔ عجیب بات ہے کہ آج کے زمانے میں انٹرنیٹ سے دین سیکھتے ہیں۔ اور کئی لوگوں کو تو سنا سنایا دین ہوتا ہے۔ ان کا استاد کوئی نہیں ہوتا۔ ادھر سے بات سن لی، ادھر سے بات سن لی، اخبار سے خبریں پڑھ لیں اور یہیں سے دین سمجھ لیا ۔

ہر آں کارے کہ بے استاد باشد
یقین دانی کہ بے بنیاد باشد

''ہر وہ کام جو بے استاد ہوتا ہے، سمجھ لو کہ وہ بے بنیاد ہوتا ہے۔''

کیا تصوف بدعت ہے؟

آج کچھ لوگ بڑے آرام سے کہہ دیتے ہیں کہ تصوف بدعت ہے۔ بھئی! یہ بدعت کہاں ہے، یہ تو روحانی بیماریوں کا علاج ہے۔ شریعت نے کہا کہ اگر تمہارے اندر تکبر ہوگا تو تمہیں جنت میں داخلہ نصیب نہیں ہو سکے گا۔ اب بتائیں کہ یہ تکبر کیسے ختم کریں؟ جو محنت تکبر ختم کرنے کا طریقہ بتائے وہ کہاں بدعت بن گئی۔

روحانی بیماریوں کے قرآنی نسخے:

ہاں! علما و مشائخ نے قرآن و حدیث پر غور کر کے وہاں سے کچھ اعمال نکالے اور ہمیں نسخہ دے دیا کہ اس نسخے پر عمل کر لو، تمہیں روحانی شفا نصیب ہو جائے گی۔ ان اعمال کا ماخذ اور مبدا قرآن عظیم الشان اور نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی بندہ ہمارے سلسلہ میں بیعت ہوتا ہے تو اس سے کہتے ہیں کہ یہ چھ اعمال کرنا شروع کر دو۔ ان کو ہم معمولات کا نام دیتے ہیں۔ ان سب معمولات کا حکم قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ ہمارے مشائخ نورِ ایمان کے ذریعے ان کو پہچانا اور

یہ ہیرے موتی نکال کر ہمیں دے دیے۔اب ذرا ان کی تفصیل سنیے۔

(۱)......ایک تو ان کو یہ کہا جاتا ہے کہ سو مرتبہ صبح اور سو مرتبہ شام درود شریف پڑھو۔اب نبی علیہ السلام پر درود شریف پڑھنے کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰـهَ وَ مَلٰٓئِكَتَه' يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (الاحزاب:۵۶)

اب بتائیں کہ 'صَلُّوا' کون سا صیغہ ہے؟ امر کا صیغہ ہے۔اللہ تعالیٰ حکم فرما رہے ہیں۔چنانچہ جو بندہ صبح اور شام درود شریف پڑھے گا وہ تو قرآن مجید کے حکم پر عمل کر رہا ہوگا۔

(۲)......صبح اور شام سو سو مرتبہ استغفار پڑھنے کو کہتے ہیں۔قرآن مجید میں استغفار پڑھنے کا حکم ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّه' كَانَ غَفَّارًا﴾ (نوح:۱۰)

یہاں ''اِستَغفِرُوْا'' کون سا صیغہ ہے؟ امر کا صیغہ ہے۔اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ استغفار کرو۔اگر کسی کو کہہ دیا جائے کہ صبح وشام استغفار کیا کرو تو یہ کہاں سے بدعت آ گئی۔بھئی! یہ تو منشائے قرآن پر عمل ہے۔

(۳)......قرآن مجید کی تلاوت کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے۔قرآن مجید میں تلاوت کرنے کا بھی حکم ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فَاقْرَءُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ (المزمل:۲۰)

بتائیں یہ ''اِقرَ ءُوْا'' کون سا صیغہ ہے؟ امر کا صیغہ ہے۔کیا ہمیں اس آیت پر عمل کرنا چاہیے؟ اگر کسی کو کہا جائے کہ ایک پارہ یا آدھا پارہ روزانہ تلاوت کیا کرو تو یہ قرآن کی منشا پر عمل ہوا، بدعت تو نہ بنی۔

(۴)...... چلتے پھرتے، لیٹے بیٹھے، ہر وقت اللہ کا دھیان رکھنے کو کہا جاتا ہے۔ یہ بھی حکم خدا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ﴾ (النساء:۱۰۲)

یہ ''اُذْکُرُوا'' کون سا صیغہ ہے؟ امر کا صیغہ ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ کھڑے ہوئے بھی، بیٹھے ہوئے بھی اور لیٹے ہوئے بھی اللہ کو یاد کرو۔ اب اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ تم وقوف قلبی رکھو، یعنی لیٹے، بیٹھے، کھڑے اللہ کو یاد رکھو، تو یہ قرآن کی منشا پر ہی عمل ہوگا۔

(۵)...... ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ ذکر قلبی (مراقبہ) کرو۔ اس ذکر قلبی کا بھی قرآن مجید میں حکم ہوا ہے۔ وہ کیسے؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ﴾ (الانفال:۲۰۵)

''اور ذکر کر اپنے رب کا اپنے نفس میں''

مفسرین نے لکھا: اَیْ فِی قَلْبِكَ ''اپنے دل میں اپنے رب کو یاد کرو'' کیسے یاد کریں؟ آگے فرمایا:

﴿تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً﴾

''گڑگڑاتے ہوئے، بہت خفیہ انداز سے۔''

تفسیر معارف القرآن میں حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً'' کے الفاظ سے قرآن مجید سے ذکر قلبی کا ثبوت ملتا ہے۔

یہاں ''و اذکر'' بھی امر کا صیغہ ہے۔ چنانچہ اگر کسی کو کہا جائے کہ قرآن مجید کی اس آیت پر عمل کرو تو یہ کہاں سے بدعت بن جائے گا۔

(۶)...... چھٹے نمبر پر بتایا جاتا ہے کہ مشائخ کی صحبت اختیار کرو۔ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کا حکم بھی قرآن مجید میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾

(التوبۃ:۱۱۹)

یہ ''کُونُوا'' بھی امر کا صیغہ ہے۔تو جو لوگ مشائخ کی صحبت اختیار کرتے ہیں وہ بھی منشائے قرآنی پر عمل کر رہے ہوتے ہیں۔

اگر ان چھ اعمال کے بارے میں کسی کو کہہ دیا جائے تو یہ کہاں سے بدعت بن جائے گی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان اعمال کو بدعت کہتے ہیں، وہ یا تو جاہل ہیں یا متجاہل ہیں۔عالم ہوتے تو کبھی بدعت نہ کہتے۔پتا چلا کہ یہ بھی منشائے قرآنی پر ہی عمل ہے۔یاد رکھیں! ہمارے مشائخ نے اپنے پاس سے کچھ نہیں کیا، ان اعمال کو قرآن وحدیث سے لے کر بتا دیا کہ بھئی! تم اس پر عمل کرو۔پھر اللہ تعالیٰ ان میں برکت رکھ دیتے ہیں اور بندے کو شفا مل جاتی ہے۔

آپ ان چھ معمولات کو باقاعدگی سے کر کے دیکھیں، آپ کو اپنی زندگی میں واضح فرق نظر آئے گا۔آپ کا اپنا دل گواہی دے گا کہ ہاں! اب میرے دل میں اللہ کی محبت پہلے کی نسبت بڑھ گئی ہے۔

روحانی بیماریوں کی حقیقت:

ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی یہ روحانی بیماریاں ہوتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں! روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔اس کی دلیل قرآن عظیم الشان سے۔اللہ تعالیٰ ایک جگہ پر ارشاد فرماتے ہیں کہ اے نبی علیہ السلام کی بیویو! پردے میں رہو، ایسا نہ ہو کہ

﴿فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ﴾ (الاحزاب:۳۲)

''کہ تمہیں دیکھ کر طمع کرے وہ بندہ جس کے اندر بیماری ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید سے ثابت ہو رہا ہے کہ جب غیر عورت کو دیکھ

کر کسی کے دل میں طمع پیدا ہوتا ہے اور شہوت اٹھتی ہے تو یہ ایک بیماری ہوتی ہے۔قرآن کہہ رہا ہے کہ ''فِی قَلبِہٖ مَرَضٌ''

اب اگر ایک بندہ نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلتا ہے اور اس کے لیے آنکھ پر کنٹرول کرنا مشکل ہوتا ہے، ادھر بھی عورت کو چلتے دیکھتا ہے اور ادھر بھی دیکھتا ہے تو بھئی! یہ تو کنفرم ہوگیا کہ اندر روگ ہے۔ہم لوگوں کو تو دھوکہ دے سکتے ہیں لیکن رب کو تو دھوکہ نہیں دے سکتے، ہمارا رب تو جانتا ہے نا، کہ یہ ادھر بھی دیکھتا ہے اور ادھر بھی دیکھتا ہے۔

☆......ہوائی جہاز پر سفر کرتے ہوئے ائیر ہوسٹس کو دیکھتے ہیں یا نہیں۔

☆......بسوں اور ویگنوں میں سفر کرتے ہوئے مسافر عورتوں کو دیکھتے ہیں یا نہیں۔

☆......راستہ چلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتے ہیں یا نہیں۔

☆......دکاندار صاحب آنے والی گاہک عورتوں کو دیکھتے ہیں یا نہیں۔

اگر ہوس بھری نظر اٹھتی ہے اور پیچھا کرتی ہے تو یہ کنفرم ہوگیا کہ روحانی بیماری ہے۔اب اگر روحانی بیماری کی کنفرمیشن بھی ہو اور بندہ علاج نہ کروائے تو پھر وہ تو قابل رحم ہوگا۔ بلکہ اطبا کہتے ہیں کہ سب سے بڑا مریض بھی وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو مریض نہ سمجھے۔ چنانچہ جن لوگوں کو ہیپاٹائٹس سی کی بیماری ہوتی ہے اور وہ اپنا علاج نہیں کرواتے کہ ٹھیک ہو جائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ چند مہینوں کے اندر ان کے جسم کے اعضا سکڑ جاتے ہیں، جن پر اثر ہوتا ہے، بالآخر وہ بندہ موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

یہی مثال روحانی بیماری کی بھی ہے کہ جب سمجھتا ہے کہ میری آنکھ پاک نہیں، اور پھر علاج نہیں کرواتا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ بے ایمان مرنے کے لیے تیار ہے۔ کیونکہ علما نے لکھا ہے کہ بدنظری کے بڑے نقصانات ہیں۔ان میں سے ایک بڑا

نقصان یہ ہے کہ موت کے وقت بندہ کلمے سے محروم ہو جاتا ہے۔ جو لوگ موت کے وقت کلمے سے محروم ہوتے ہیں ان میں سے اکثر وہ ہوتے ہیں جو بدنظری کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے یہ سوال پوچھا: حضرت! گناہ تو اور بھی بڑے ہیں، لیکن یہ بدنظری اتنا بڑا گناہ ہے کہ انسان ایمان سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔...... ذہن میں ایک دو واقعات بھی تھے۔ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید جارہا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ اس کی نظر ایک خوب صورت لڑکے پر پڑی تو وہ پوچھنے لگا: حضرت! ایسے حسین لوگ بھی جہنم میں جائیں گے؟ حضرت نے فرمایا: تو نے بری نظر ڈالی ہے، توبہ کرلے۔ اس نے جواب دیا: حضرت! نہیں نہیں، میں نے تو ایسے ہی کہا ہے۔ بہانہ کر دیا۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس پر اس بدنظری کا اتنا وبال پڑا کہ بیس سال کے بعد قرآن اس کے سینے سے نکل گیا اور وہ قرآن مجید بھول گیا۔

ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ ایک اور بھی واقعہ نقل کرتے ہیں کہ مؤذن اذان دینے کے لیے مینارے پر چڑھا اور ہمسائے کے گھر میں نظر پڑی۔ ان کی ایک جوان لڑکی تھی۔ ایک بدنظری کا ایسا اثر ہوا کہ بالآخر ایمان سے محروم ہو گیا۔ یہ واقعات بندے کو ڈراتے ہیں...... اس لیے اس عاجز نے یہ سوال کیا اور عرض کیا: حضرت! بدنظری کے ان واقعات کو پڑھ کر تو بڑا ڈر لگتا ہے، کیا یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ بندہ ایمان سے ہی محروم ہو جاتا ہے...... دیکھو! قتل کرنے والے کو ایمان سے محروم نہیں کیا گیا، چوری کرنے والے کو محروم نہیں کیا گیا، لیکن بدنظری کرنے والے کو ایمان سے محروم ہونے کا کہا گیا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہاں! اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ رب العزت کی غیرت کا معاملہ ہے۔ چونکہ انسان غیر کی طرف للچائی نظر سے دیکھتا ہے، اس لیے اللہ کو

غیرت آتی ہے کہ ارے! تو حسن دینے والے کو بھول گیا اور حسن کے پیچھے دیوانہ بن گیا۔ میری طرف سے تو نے نظریں ہٹا لیں اور مخلوق کے اوپر نظریں جما لیں۔ اللہ رب العزت کی یہ غیرت برداشت نہیں کرتی۔ آپ ذرا غور کریں کہ بیوی سب کچھ برداشت کر جاتی ہے لیکن مرد اگر کسی غیر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے تو بیوی کو برداشت نہیں ہوتا۔ یہی اللہ رب العزت کا معاملہ ہے۔ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((اَنَا اَغْیَرُ وُلِدَ اٰدَمُ وَاللّٰہُ اَغْیَرُ مِنِّیْ))

''میں انسانوں میں سے سب سے زیادہ غیور ہوں اور اللہ رب العزت مجھ سے بھی زیادہ غیور ہیں''

اس لیے یہ بدنظری بہت بڑا گناہ بن جاتی ہے۔ نظر نہیں آتا۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ انسان کا من بیمار ہے۔ اب جب بیمار ہے تو پھر علاج کروائے۔

باطنی بیماری ہونے کی ایک اور دلیل بھی ہے۔ جب ہم نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو اس نماز میں ہمارا دھیان نماز کی طرف ہوتا ہے یا دنیا کی طرف ہوتا ہے؟ اپنا دل گواہی دے گا۔ اگر تکبیر تحریمہ یعنی شروع میں اللہ اکبر کہنے سے سلام پھیرنے تک اللہ تعالیٰ کا دھیان رہتا ہے اور اَنْ تَعْبُدُ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ والی کیفیت ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ من سنورا ہوا ہے، اور اگر کھڑے ہوتے ہی پچھلے قصے بھی یاد آنے لگ جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ من بیمار ہے۔ کئی مرتبہ تو دنیا کے کام کاج تو کیا، نماز میں کھڑے ہوتے بندہ گناہوں کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ اس عاجز نے کسی شہر میں نماز کے عنوان پر بیان کیا تو بعد میں ایک عالم وہیں پر ملنے کے لیے آئے۔ ان کی بھنویں اور داڑھی سفید تھی۔ کہنے لگے: میں پچھلے چھبیس سال سے بخاری شریف پڑھا رہا ہوں اور جیسی نماز کے بارے میں آپ نے

بیان کیا، مجھے زندگی میں ایسی ایک نماز بھی نصیب نہیں ہوتی۔

خیر! ان کو اس کے بارے میں بتایا اور سمجھایا، ساتھی بتانے لگے کہ یہ فلاں جگہ پر غیر مقلدوں کا جو مدرسہ ہے اس میں بخاری شریف کے شیخ الحدیث ہیں۔ اب اندازہ کریں کہ وہ شیخ الحدیث جو چھبیس سال سے بخاری شریف پڑھا رہے ہیں وہ خود فرماتے ہیں کہ مجھے ایک نماز بھی ایسی نصیب نہیں ہوئی۔

میں نے جواب میں ان سے پوچھا: کیا آپ نماز سیکھنے کے لیے کسی کے پاس گئے ہیں؟ کہنے لگے: میں گیا تو نہیں ہوں۔ میں نے کہا: پھر تم تصوف کو کیوں بدعت کہتے ہو؟ کیوں مخالفت کرتے ہو تصوف کی؟ من کی صفائی کے طریقے کو بدعت کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ آؤ نا، اللہ والوں کی صحبت میں چند دن رہو اور دیکھو، کیسے تمہاری نماز بنتی ہے۔ کیسے دل میں اللہ کی محبت بڑھتی ہے۔ ایسی محبت نصیب ہوگی کہ آپ تہجد کی نیت باندھیں گے تو سجدے سے سر اٹھانے کو دل نہیں کرے گا۔ ہمارے مشائخ ایسی نمازیں پڑھتے تھے۔ چنانچہ اگر جسمانی بیماریوں کا علاج کروانا ضروری ہے تو روحانی بیماریوں کا علاج کروانا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ انسان ایمان سے محروم ہو جائے۔

فقہ الظاہر اور فقہ الباطن:

شریعت نے کچھ کام کرنے کا حکم دیا ہے اور کچھ کام نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کو ''مامورات'' کہتے ہیں اور جن کاموں کو نہ کرنے کا حکم دیا ہے ان کو ''منہیات'' کہتے ہیں۔

اب مامورات میں دو طرح کے احکام ہیں۔ بعض کا تعلق ظاہر سے ہے اور بعض کا تعلق باطن سے ہے۔ مثال کے طور پر فرمایا:

نماز پڑھو...... ظاہر سے تعلق

روزہ رکھو......ظاہر سے تعلق

حج کرو......ظاہر سے تعلق

زکوۃ ادا کرو......ظاہر سے تعلق

قربانی کرو......ظاہر سے تعلق

اور کچھ ایسے اعمال ہیں جن کا تعلق باطن سے ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

توکل کرو......اس کا تعلق باطن سے ہے

صبر کرو......اس کا تعلق باطن سے ہے

شکر کرو......اس کا تعلق باطن سے ہے

اس لیے کہ یہ چیزیں بندے کو نظر تو نہیں آتیں۔ یہ تو من کی کیفیتوں کے نام ہیں۔

اسی طرح منہیات کا معاملہ ہے۔ ان میں بھی دو طرح کے اعمال ہیں۔ بعض کا تعلق ظاہر سے ہے اور بعض کا تعلق باطن سے ہے۔ مثلاً شریعت نے کہا: چوری نہ کرو، شراب نہ پیو، قتل نہ کرو، زنا نہ کرو۔ ان تمام کا تعلق ظاہر سے ہے اور شریعت نے ان سے منع کیا ہے۔ اور شریعت کی کچھ منع کردہ باتوں کا تعلق باطن سے ہے۔ مثلاً فرمایا:

......حسد نہ کرو۔ اب بتائیں کہ کیا کسی کو آنکھ سے حسد نظر آتا ہے۔ آنکھ سے تو نظر نہیں آتا۔ اللہ ہی جانے کسی کے دل میں کیا ہے۔

......دل میں کینہ نہ رکھو۔ کیا پتہ کے کس کے دل میں کینہ بھرا ہوا ہے۔ اس کو پنجابی میں ''وٹ رکھنا'' کہتے ہیں۔ اپنے دل میں کسی کے بارے میں بَیر رکھنا۔ اس کو شریعت میں کینہ کہتے ہیں۔

......تکبر سے بچو۔ یہ باطنی بیماری بھی نظر نہ آنے والی چیز ہے۔

یہ سب کے سب باطن کے وہ اعمال ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔

وہ تمام مامورات یا منہیات جن کا تعلق ظاہر سے بنتا ہے ان کو شریعت کی نظر میں فقہ کہتے ہیں ۔ یہ فقہ الظاہر ہے۔ اور وہ تمام مامورات یا منہیات جن کا تعلق باطن سے ہے ان تمام کے علم کو تصوف کہتے ہیں ۔ اور یہ فقہ الباطن ہے۔

تزکیہ نفس کی اہمیت:

ان سب کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے من کی بیماریاں ختم ہو جائیں ۔ اگر کپڑے میں میل ہو تو اس کو دھونا پڑتا ہے۔ اس کا ایک طریقہ کار ہے۔ پانی لگاؤ، صابن لگاؤ، اس کو نچوڑو۔ اس سے میل ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کے من میں بھی گناہوں کی میل آجاتی ہے۔ ان گناہوں کی میل کو صاف کرنے کا نام ''من کی صفائی'' ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس تزکیہ نفس کی اہمیت قرآن مجید میں بیان فرمادی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ (الاعلیٰ:۱۴)

''تحقیق فلاح پا گیا وہ جو ستھر ہوا''

تو جو بندہ بھی اپنے من سے میل ختم کرے گا وہ فلاح پائے گا۔ بلکہ قرآن مجید میں ایک جگہ پر سات مرتبہ قسمیں کھا کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے من کو صاف کرنے والا فلاح پائے گا۔ آپ غور کریں کہ ایک معتمد بندے کا ایک مرتبہ قسم کھا لینا کافی ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ دو مرتبہ قسم کھائے، تین مرتبہ قسم کھائے، اللہ تعالیٰ نے ایک ہی دم میں سات مرتبہ قسمیں کھائیں۔

﴿وَ الشَّمْسِ وَضُحٰهَا﴾......ایک قسم

﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا﴾......دوسری قسم

﴿وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا﴾...... تیسری قسم

﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا﴾...... چوتھی قسم

﴿وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا﴾...... پانچویں قسم

﴿وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا﴾...... چھٹی قسم

﴿وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰاهَا﴾...... ساتویں قسم

پھر آگے فرمایا:

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ (الشمس:١)

سات قسمیں کھا کر ارشاد فرمایا کہ جو اپنے نفس کو ستھرا کر لے گا وہ کامیاب ہو جائے گا۔ اب ہمیں اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا چاہیے کہ یہ من کی صفائی کتنی ضروری ہوتی ہے۔

نفس کا تزکیہ کرنا، یہ بعثت کے مقاصد میں سے ہے۔ اسی لیے جب نبی علیہ السلام تشریف لائے تو آپ کی بعثت کے چار مقاصد بیان کرتے ہوئے اس کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ يُزَكِّيْهِمْ﴾

''آپ ان کا تزکیہ فرمائیں گے اور آپ ان کو ستھرا فرمائیں گے۔''

اس سے بھی بات سمجھ میں آتی ہے کہ واقعی انسان کو اپنے من کی صفائی کے لیے محنت کرنی چاہیے اور تزکیہ نفس حاصل کرنے کے لیے کوشش میں لگے رہنا چاہیے۔

تصوف ایک حقیقت ہے:

اسی بات کو ایک اور زاویے سے آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں:

ایک تھیں تعلیماتِ نبوی اور ایک تھیں کیفیاتِ نبوی۔ تعلیماتِ نبوی ﷺ کو ''علم شرائع'' (شرع کا علم) کہتے ہیں۔ اور کیفیاتِ نبوی ﷺ کو ''علم الاحسان'' کہتے

ہیں۔اسی علم الاحسان کا دوسرا نام تصوف ہے۔بھئی! ہم اگر اس کو تصوف کہتے ہیں اور آپ کو اس نام سے چڑ ہے تو آپ اس کو تزکیہ کہہ دیں یا علم الاحسان کہہ لیں، یہ تو قرآن و حدیث کے الفاظ ہیں۔اللہ تعالیٰ اس کا تذکرہ قرآن مجید میں یوں فرماتے ہیں:

﴿وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (ال عمران:۱۳۴)

''اور اللہ تعالیٰ محسنین سے محبت فرماتے ہیں''

آپ اپنی پسند کا نام دے لیں۔بھئی! جو اللہ چاہتے ہیں وہی نام مشہور ہو جاتے ہیں۔اسی طرح ''تصوف'' نام بھی شہرت پا گیا ہے۔ورنہ شروع میں اس کو علم الاحسان ہی کہتے تھے۔''تزکیہ کا علم'' ہی کہتے تھے۔ارے! ناموں سے کیا ہوتا ہے، اصل میں تو حقیقت کو دیکھا جاتا ہے۔ایک آدمی کسی چیز کو ''A'' کہے۔دوسرا ''B'' کہے اور تیسرا ''C'' کہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔چیز تو وہی ہوتی ہے جو ہے۔تو تصوف ایک حقیقت ہے جس کو مانے بغیر چارہ ہی نہیں۔

نماز، سیکھ کر پڑھیے:

ایسے بندے کو کبھی بھی حضوری کی نماز نصیب نہیں ہوتی جو تصوف کا مخالف ہو۔نمازیں تو پڑھتا ہے، مگر نفس کے خیالات کے ساتھ پڑھتا ہے۔اب اگر ایسی ہی نمازیں اللہ کے حضور بھیجنی ہیں تو پھر آدمی کی اپنی مرضی کی بات ہے۔ورنہ کم از کم سیکھنے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضرت! میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ مجھے ایک نمازِ صحابہ جیسی پڑھا دیجیے۔...... یہ ہے بیعت کا اصل مقصد...... کیا ہی خوب صورت بات کہی۔چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا: بہت اچھا۔

رات کو وہاں قیام کیا۔ جب رات کا آخری پہر ہوا تو حضرت نے نام لے کر پکارا: اٹھ گئے ہو؟ عرض کیا: جی حضرت! اٹھ گیا ہوں۔ فرمایا: جاؤ! اللہ کے لیے وضو کر کے آؤ۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب یہ فرمایا کہ اللہ کے لیے وضو کر کے آؤ۔ پتہ نہیں اس لفظ نے میرے دل پر کیا اثر کیا کہ میرے اوپر اللہ تعالیٰ کی ذات کا استحضار شروع ہو گیا کہ میں اللہ کے سامنے ہوں۔ اب وضو بھی کر رہا ہوں اور آنکھوں سے آنسو بھی نہیں تھمتے۔

جب وضو کر کے آیا تو عرض کیا: حضرت! میں وضو کر کے آ گیا ہوں۔ فرمایا: جاؤ! اللہ کے لیے دو رکعت پڑھ لو۔ کہتے ہیں کہ اللہ کے لفظ میں کیا اعجاز تھا کہ میں نے نماز کی نیت باندھی۔ پھر نیت باندھنے سے لے کر سلام پھیرنے تک مجھے اپنا ہوش بھی نہ رہا۔ یہی استحضار تھا کہ میں اپنے رب کے سامنے ہوں۔ فرماتے ہیں کہ زندگی میں میں نے ایسی نماز نہیں پڑھی تھی۔ ہمارے مشائخ ایسی نمازیں پڑھتے تھے۔

ایک بزرگ تھے۔ ان سے کسی نے پوچھا: حضرت! آپ کو نماز میں دنیا کا خیال آتا ہے؟ فرمانے لگے: نہ نماز کے اندر آتا ہے اور نہ نماز کے باہر آتا ہے۔ اس تزکیہ کا یہ فائدہ ہے کہ انسان پھر ایسی نمازیں پڑھتا ہے۔

ہمارے دل میں بھی تو یہ تمنا ہونی چاہیے کہ ہم بھی زندگی میں دو رکعتیں ایسی پڑھ جائیں کہ ان میں اللہ اکبر سے لے کر سلام پھیرنے تک اللہ کے سوا کسی کا خیال نہ آئے۔ دل میں حسرت اور تمنا بھی ہو اور انسان اس کے لیے کوشش بھی کرے۔ یاد رکھیں! بغیر صحبت کے ہزاروں بار ایسی نمازیں پڑھنے کی کوشش کریں گے مگر یہ کیفیت نصیب نہیں ہو گی۔ کچھ نوجوانوں نے بتایا: حضرت! ایک دفعہ ہم نے یہ کوشش کی کہ ہم نے نماز میں کچھ نہیں سوچنا، اور پوری نماز میں یہی سوچتے رہے کہ کچھ نہیں سوچنا۔ نفس اور شیطان انسان کے ایسے دشمن ہیں۔ تو کوشش کرنی چاہیے کہ حضوری والی نماز

نصیب ہو جائے اور میرے آقا ﷺ پر احسان کی جو کیفیت تھی اس کی ایک جھلک نصیب ہو جائے۔

نبی علیہ السلام سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو فرمایا کرتے تھے:

اَرِحنِی یَابِلَال ! ''اے بلال! میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاؤ (یعنی اذان دے دو)''

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی علیہ السلام ہمارے درمیان میں ہوتے تھے۔ہم باتیں کر رہے ہوتے تھے۔اچانک مسجد سے اذان کی آواز آتی تھی اور اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ ایسے ہو جاتے تھے کہ جیسے مجھے پہچانتے ہی نہیں۔میں سامنے آتی تھی تو فرماتے تھے: مَن اَنتِ ''تو'' کون ہے؟''۔میں کہتی: میں ابوبکرؓ کی بیٹی ہوں۔ پھر پوچھتے: مَن اَبُوبَکر ؟''ابوبکر کون ہیں؟''۔اس سے میں سمجھ جاتی تھی کہ اذان کی آواز سن کر میرے آقا ﷺ پر اللہ کی محبت کا ایسا غلبہ ہو گیا ہے کہ اب وہ کسی کو نہیں پہچانیں گے جب تک نماز نہ پڑھ لیں۔

علم الشرائع اور علم الاحسان:

تعلیماتِ نبوی نبی اکرم ﷺ کی مبارک زبان سے صادر ہوئیں، ان کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے کانوں سے سنا اور پھر ان سے یہ علم حدیث کی شکل میں آگے چلا۔اس کو علم الشرائع کہتے ہیں۔اور جو کیفیات نبوی تھیں وہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کی صحبت میں بیٹھ کر سیکھیں۔وہ دل سے دل میں منتقل ہوئیں، ان کو ''علم الاحسان'' کہتے ہیں۔اب اگر کوئی یہ پوچھے کہ یہ کیفیات کہاں سے آ گئیں تو یہ روایت ان کے لیے مینارہ نور ثابت ہو گی۔

نفاق کا ڈر:

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ گھر میں بیٹھے ہیں۔سوچتے ہیں کہ میرے دل کی جو حالت

میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت میں ہوتی ہے، گھر میں بیوی بچوں کے درمیان وہ حالت نہیں ہوتی۔ بس یہی سوچ کر کہنے لگے: نافق حنظله، نافق حنظله۔ ''حنظلہ منافق ہو گیا، حنظلہ منافق ہو گیا۔'' چنانچہ وہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں چل پڑے۔

راستے میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی۔ پوچھا: حنظلہ! کہاں جا رہے ہو؟ جواب میں اپنے بارے میں کہنے لگے: حنظلہ تو منافق ہو گیا ہے۔ پوچھا: کیسے؟ کہنے لگے: جو کیفیت نبی علیہ السلام کی صحبت میں ہوتی ہے وہ گھر میں نہیں ہوتی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بھئی! یہ حالت تو ہماری بھی ہے۔ آؤ! چلتے ہیں اور نبی علیہ السلام سے پوچھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جب نبی علیہ السلام سے پوچھا تو نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: حنظلہ! تمہاری یہ کیفیت اگر ہر وقت رہے تو راستے میں اللہ کے فرشتے اتر کر تمہارے ساتھ مصافحہ کریں۔

ایک سوال کا دلچسپ جواب:

اب یہاں طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا گھر میں ان کا ایمان کم ہوتا تھا اور نبی علیہ السلام کی صحبت میں پورا ہو جاتا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ایمان تو پورا ہی ہوتا تھا مگر اس ظاہری فرق کی ایک وجہ تھی۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ سمندر کے اوپر کچھ دن ایسے ہوتے ہیں جب اس کی سطح بالکل خاموش ہوتی ہے۔ پانی میں کوئی مدوجزر نہیں نظر آتی۔ اور جب چودھویں کی رات کا چاند پورا ہوتا ہے تو ہائی ٹائیڈ کا وقت آجاتا ہے۔ وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ پانی کی لہریں پچیس پچیس فٹ یا پچاس پچاس فٹ تک اچھل اچھل کر پڑ رہی ہوتی ہیں۔ بھئی! سمندر کا پانی بڑھ تو نہیں گیا۔ سمندر میں ہیجان آ گیا ہے۔ سمندر کے اندر مدوجزر آ گئی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان کی یہی کیفیت تھی۔ گھر میں جاتے تھے تو ایمان کا لیول پرسکون نظر آتا تھا اور میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں آتے تھے تو اس ماہتاب نبوت کے سامنے ان کے ایمان کے سمندر میں مدو جزر آجاتی تھی۔ اللہ والوں کی صحبت میں بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان ان کی صحبت میں آتا ہے تو اس کو اپنے ایمان کے اندر ایک حرارت محسوس ہوتی ہے۔

فقہ اور تصوف کے امام:

علم الشرائع سکھانے والوں کو علمائے کرام کہتے ہیں اور جو علم الاحسان سکھاتے ہیں ان کو مشائخ کرام کہتے ہیں۔ کتاب وسنت پر غور وخوض کر کے جنہوں نے جنہوں نے مسائل کا استنباط کیا ان کو فقہ کا امام کہتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے ائمہ مانے گئے۔ محدثین نے ان کی پیروی کی۔ محدثین نے ان کے قول پر عمل کیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ فقہا تھے۔ انہوں نے قرآن وحدیث کے سمندروں میں غوطے لگا کر ہیرے اور موتی نکالے اور علما کے سامنے پیش کیے۔ یہ استنباط شریعت کے عین مطابق تھا۔ قرآن مجید میں باقاعدہ لفظ ہے۔ فرمایا: يَسْتَنبِطُونَهُ۔ کہ یہ اہل علم کے پاس آئے تو وہ اس بات کا استنباط کر لیتے ہیں۔ اور جنہوں نے علم الاحسان میں غور وخوض کر کے روحانی بیماریوں کے علاج کے جوابات نکالے ان کو بھی اپنے وقت میں تصوف کا امام اور مشائخ کہا گیا۔

رنگ، رنگ فروش اور رنگ ریز:

کتاب وسنت رنگ ہے اور علماء رنگ فروش ہیں۔ جو ان کے پاس آتا ہے اس کو اس رنگ کے بارے میں پوری تفصیلات بتا دیتے ہیں، بلکہ رنگ ہی دیتے ہیں۔ لیکن ایک ہوتا ہے، رنگ ریز۔ رنگ چڑھانے والا۔ جی ہاں! رنگ اور ہوتا ہے، رنگ فروش اور ہوتے ہیں اور رنگ چڑھانے والے اور ہوتے ہیں۔ بازاروں میں رنگ ریزوں کی دکانیں ہوتی ہیں۔ آپ کوئی کپڑا لے کر جائیں اور کہیں کہ یہ رنگ چڑھا

دیں تو وہ وہی رنگ چڑھا دیتے ہیں۔ چنانچہ

......کتاب وسنت رنگ ہے

......علمائے کرام رنگ فروش ہیں

......مشائخ عظام رنگ ریز ہیں۔

جو بندہ بھی مشائخ عظام کی صحبت میں آتا ہے وہ اس کے دل پر اللہ کا رنگ چڑھا دیتے ہیں۔

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ (البقرۃ:۱۳۸)

''اللہ کا رنگ، اور اللہ کے رنگ سے بہتر کوئی رنگ نہیں ہوتا۔''

''اہلِ ذکر'' سے رابطہ رکھنے کا حکم:

ہمیں علما اور مشائخ دونوں سے رابطہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا کہ علما سے تعلق جوڑ کر علم الشرائع سیکھیں اور مشائخ سے تعلق جوڑ کر باطن کا علم سیکھیں۔ قران مجید میں فرمایا:

﴿فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

''اگر تم نہیں جانتے تو پھر اہل علم سے پوچھ لو۔''

یہاں علما نے اہل ذکر سے مراد اہل علم لکھا ہے۔ بتائیں! فَاسْئَلُوْا کون سا صیغہ ہے؟ امر کا صیغہ ہے۔ اس کا مطلب یہی نکلا کہ علما سے رابطہ رکھو، ان سے دین سیکھو اور ان سے شریعت کے احکام سیکھو۔ ہم میں سے ہر بندے کو حکم ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی فرمایا:

﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبۃ:۱۱۹)

''اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔''

بتائیں! کُوْنُوْا کون سا صیغہ ہے؟ امر کا صیغہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ

مشائخ کی صحبت میں بیٹھنے کا حکم ہے۔ اگر ہم مدارس میں بیٹھیں گے تو ہم شریعت کا علم سیکھیں گے اور اگر مشائخ کے پاس خانقاہوں میں بیٹھیں گے تو باطن کا علم سیکھیں گے۔ البتہ کچھ ایسی بھی شخصیتیں ہوتی ہیں جو مرج البحرین ہوتی ہیں۔ اللہ رب العزت ان کو علم ظاہر اور علم باطن دونوں عطا فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے بہت سے ایسے مشائخ گزرے جو ظاہر میں بھی جبال علم میں سے تھے۔ مثلاً: حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور یہ ساری کی ساری شخصیتیں عین اسی وقت علم باطن کے بھی امام تھے اور ان کی باطنی پرواز بہت بلند تھی۔ تو جہاں ظاہر کی تعلیم دی جاتی ہے اس جگہ کو ''مدرسہ'' کہا جاتا ہے اور جہاں باطن کی تعلیم دی جاتی ہے اس کو ''خانقاہ'' کہا جاتا ہے۔

علوم شرعیہ اور تصوف میں چار چار امام کیوں؟

یہ اللہ رب العزت کا تکوینی معاملہ ہے کہ

☆......اللہ رب العزت نے اس دنیا میں اپنی چار کتابیں نازل فرمائیں۔ زبور، تورات، انجیل اور قرآن مجید۔

☆......اسی طرح نبی علیہ السلام کے چار خلفائے راشدین ہیں۔ ابوبکر و عمر، عثمان و علی رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

☆......اس سے آگے بھی اللہ رب العزت نے مہربانی کی کہ علم الشرائع میں بھی یوں تو درجنوں ائمہ سے فقہ کا آغاز ہوا۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کی اقتدا ہوئی، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی اقتدا ہوئی، حماد رحمۃ اللہ علیہ کی اقتدا ہوئی۔ لیکن ان میں سے صرف چار ایسے حضرات تھے جن پر امت مجتمع ہوئی۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ

اگر یہاں کوئی یہ سوال کرے کہ دین میں یہ چار ہی امام کیوں ہیں؟ تو اس کا

جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ اگر کسی کے ایک درجن بیٹے ہوں اور ایک ایک کر کے وہ مرتے رہیں اور باقی چار رہ جائیں تو میراث کتنے بیٹوں میں تقسیم ہوگی؟ چار بیٹوں میں تقسیم ہوگی نا۔اب اگر کوئی یہ پوچھے کہ یہ چار ہی میں کیوں تقسیم ہوگی تو کہیں گے: اللہ کی مرضی۔ ایسے ہی جو بندہ یہ پوچھے کہ اب چار ہی امام کیوں؟ تو کیا جواب دیں گے؟ جی! اللہ کی مرضی۔ یہ تو اللہ کے ہاں قبولیت ہے۔

اسی طرح علم الاحسان میں بھی چار حضرات ایسے تھے جن کو امام کا درجہ ملا۔ان میں سے ایک شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، دوسرے شیخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ، تیسرے حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ، اور چوتھے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ۔ پھر ان چاروں بزرگوں کے نام پر چار سلسلے مشہور ہو گئے۔

علم الاحسان کا ثبوت:

اگر کوئی یہ پوچھے کہ علم الاحسان کا کہاں سے ثبوت ملتا ہے؟...... علم الشرائع کے بارے میں تو نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ((اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَی اللَّحْدِ)) اور یہ بھی فرمایا: ﴿طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰی كُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ﴾ ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ علم کو سیکھنا چاہیے۔ پھر یہ علم الاحسان کہاں سے آ گیا؟

بخاری شریف کی ایک روایت ہے جس کو علما حدیث جبرئیل کہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

ہم نبی علیہ السلام کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ایک آدمی آیا۔اس کے کپڑے بھی بڑے سفید تھے اور بال بھی بڑے کالے تھے۔کوئی گرد وغیرہ کا نام ونشان نہیں تھا...... مٹی وغیرہ کا نام ونشان نہ ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ دور سے نہیں قریب سے آیا ہے۔ کیونکہ اگر دور کا سفر کر کے آتا تو اس پر مٹی وغیرہ ہوتی۔اور

درماندگی اور تھکاوٹ کے آثار نظر آتے۔ وہ تو بڑا فریش تھا۔ جب اس طرح سے آیا تو ہمیں محسوس ہوا کہ یہ قریب کا آدمی ہے۔ لیکن اس وقت جتنے بھی لوگ بیٹھے تھے ان میں سے اس کو پہچانتا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس سے یہی سمجھ آتی تھی کہ یہ قریب کا نہیں ہے۔ بھئی! کوئی تو پہچانتا کہ یہ کس قبیلے کا ہے اور کس شہر کا ہے، کوئی بھی نہیں پہچانتا تھا۔ کہنے لگے ہم بڑے حیران ہوئے...... وہ آئے اور نبی علیہ السلام کے سامنے اس طرح بیٹھ گئے کہ رُکْبَةٌ اِلَی رُکْبَتَیْنِ۔ محبوب ﷺ کے گھٹنوں کے ساتھ اپنے گھٹنے ملا دیئے...... ماشاءاللہ......!!!

پھر اس نے نبی علیہ السلام سے سوال پوچھا:

مَا الاِیمَان؟ ''ایمان کیا ہے؟''

نبی علیہ السلام نے جواب دیا۔ جب آپ ﷺ نے جواب دیا تو اس نے کہا:

صَدَقْتَ ''آپ نے سچ فرمایا۔''

ہم بہت حیران ہوئے کہ پوچھ اس طرح رہا ہے جیسے پتہ ہی نہیں اور جواب ملنے پر صَدَقْتَ اس طرح کہہ رہا ہے جیسے پہلے ہی اس کو پتہ ہے۔

پھر اس نے دوسرا سوال پوچھا:

مَا الاِسْلَام؟ ''اسلام کیا ہے۔''

نبی علیہ السلام نے پھر جواب دیا۔ وہ پھر کہنے لگا:

صَدَقْتَ ''آپ نے سچ فرمایا۔''

اس پر ہم اور زیادہ حیران ہوئے۔

پھر تیسرا سوال پوچھا:

مَا الاِحْسَان؟ ''احسان کیا ہے۔''

تو نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((اَنْ تَعْبُدُوا اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ وَ اِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ))

''کہ تو اللہ کی عبادت ایسے کر جیسے تو اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے، اور اگر تجھے یہ کیفیت نصیب نہیں تو ایسے عبادت کر کہ جیسے اللہ تجھے دیکھتا ہے۔''

یہ ہے احسان۔ خود اللہ نے اس کا نام ''احسان'' پسند کیا۔

وہ آدمی یہ تین سوال پوچھ کر چلا گیا۔ بعد میں نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((هٰذَا جِبْرَئِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ)) (صحیح مسلم: ۱/۲۷)

''یہ جبرئیل تھے، یہ تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔''

اس لیے کہ بعض باتیں بندہ خود نہیں پوچھ سکتا۔ اللہ نے سبب بنا دیا باتیں کھلنے کا۔

اب دیکھیے! نبی علیہ السلام کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ **يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ** ''تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے۔'' کیوں جی! پھر علم الاحسان، دین ہے یا نہیں؟ بالکل دین ہے۔ اور جو بندہ یہ کہے کہ یہ بدعت ہے تو اسی سے پتہ چل گیا کہ ان کا مبلغ علم کتنا ہے۔ پتہ چل گیا کہ ان بے چاروں کو قرآن اور حدیث کا کتنا علم ہے۔ بہر حال اس حدیث سے یہی پتہ چلا کہ یہ باطن کی صفائی، تزکیہ اور علم الاحسان دین ہے۔ یہ دین سے کوئی الگ چیز نہیں۔

حدیثِ جبرئیل کے جزیات پر ایک نظر:

اب اس حدیث پاک پر تھوڑا سا غور کریں کہ اس میں تین اہم اور بنیادی سوال پوچھے گئے۔ ایک ایمان کے متعلق، دوسرا اسلام کے متعلق اور تیسرا احسان کے متعلق...... اب ذرا توجہ فرمائیں۔

- ...... ایمان کے متعلق جو باتیں ہوتی ہیں وہ ''ماننے کی باتیں'' ہوتی ہیں۔ ایمان کہتے ہی ماننے کو ہیں۔
- ...... اسلام کے متعلق جو باتیں ہوتی ہیں وہ ''کرنے کی باتیں'' ہوتی ہیں۔

⊙ ......احسان کے متعلق جو باتیں ہوتی ہیں وہ ''سمجھنے کی باتیں'' ہوتی ہیں۔

اب اگر انسان کا ایمان بغیر سمجھ کے ہو تو وہ کمزور ہوتا ہے اور اگر سمجھ کے ساتھ ایمان ہو تو وہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

ایک صاحب مناظرہ کرنے لگے۔ مناظرے کے دوران فریق مخالف نے کہا: میں تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہوں اور تم تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو کافر سمجھو۔ جواب میں وہ مناظر صاحب کہنے لگے: اچھا ایسے ہی سہی۔ فَقَدْ کَفَرَ ''وہ تو کافر ہو گیا''۔ اس کے پاس ایمان تھا مگر سمجھ نہیں تھی۔ اس بدبخت نے اس کو ایمان سے محروم کر دیا۔ ہم زندگی میں ایک لمحہ کے لیے بھی ایسا نہیں کہہ سکتے...... جیسے قمیص ہے، وہ ہر وقت جسم پر ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ننگا شمار ہوگا۔ ایسے ہی دین ہے اور یہ ہر وقت ضروری ہے، ورنہ دین سے انسان خالی ہوگا۔ چونکہ اس بے چارے کو سمجھ نہیں تھی اس لیے اس نے کہہ دیا: اچھا! تھوڑی دیر کے لیے میں اپنے آپ کو کافر سمجھ لیتا ہوں۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

بس! یہ بات یاد رکھیں کہ جب سمجھ کر ایمان لایا جائے تو وہ مضبوط ہوتا ہے اور اگر بے سمجھے کی باتیں ہوں تو محروم ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ جس کو چیز کی قیمت کا پتہ ہی نہ ہو وہ اس کی حفاظت کیسے کرے گا؟

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جب میں بچہ تھا اس وقت والدہ نے سونے کی انگوٹھی بنوا کر میری انگلی میں پہنا دی۔ میں وہ پہن کر باہر نکلا تو ایک ٹھگ آ گیا۔ اس کے پاس گڑ تھا۔ اس نے مجھے گڑ کی ڈلی چکھائی۔ اس نے پوچھا: سناؤ! کیسی ہے؟ میں نے کہا: بڑی میٹھی ہے۔ پھر کہنے لگا: اب اپنی انگوٹھی کو چوسو۔ میں نے اسے چوسا تو اس میں کوئی لذت ہی نہیں تھی۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا: یہ میٹھی چیز تم لے لو اور وہ پھیکی چیز مجھے دے دو۔ میں تیار ہو گیا۔ چنانچہ میں نے گڑ کی ڈلی لے لی اور سونے کی انگوٹھی

دے دی۔

جو بے سمجھے ایمان لائے گا اس کا یہی حال ہوگا۔وہ اس سے جلدی محروم ہو جائے گا۔اس لیے ''احسان'' ایمان کی حفاظت کا سبب ہے۔جس کو احسان والی کیفیت حاصل ہوگی وہ کبھی ایمان سے محروم نہیں ہوگا۔

ملا جیون رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کے انسان کے ایمان کو سب سے زیادہ خطرہ موت کے وقت ہوتا ہے۔کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے مرتے وقت شیطان ایسے حربے استعمال کرتا ہے کہ وہ ایمان سے محروم ہو جاتے ہیں۔تو موت کے وقت اس بندے کا ایمان سلامت رہے گا جس کے پاس ایمان کے ساتھ احسان بھی ہوگا۔اس وقت یہ ظاہری دلیلیں نہیں چلتیں۔

عالم نزع میں شیطان کا حملہ:

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایک سو دلیلیں قائم کیں۔کہتے ہیں کہ جب ان کی موت کا وقت آیا تو شیطان بد بخت آ گیا۔وہ مردود کہنے لگا: رازی خدا تو موجود ہی نہیں ہے۔انہوں نے فرمایا: اس کے تو بے شمار دلائل ہیں۔چنانچہ پھر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دلیل دی۔مگر اس مردود نے دلیل کو توڑ دیا۔انہوں نے پھر دوسری دلیل دی۔اس نے پھر توڑ دی۔اس طرح امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے سو دلیلیں دیں اور اس نے سو دلیلوں کو توڑ دیا۔اس سے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ گھبرا گئے۔مگر ان کا اللہ والوں سے تعلق تھا۔جب گھبرائے تو ان کو اپنے شیخ کا چہرہ نظر آیا۔شیخ اس وقت جلال میں تھے اور فرما رہے تھے: رازی! تو اس بد بخت کو یہ کیوں نہیں کہتا کہ میں اللہ کو بغیر دلیل کے مانتا ہوں۔

اللہ اکبر! ایمان محفوظ ہو گیا کیونکہ شیطان کے پاس اس بات کا توڑ نہیں تھا۔تو موت کے وقت شیطان کا حملہ سب سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔اس وقت جس کے

پاس ایمان کے ساتھ احسان بھی ہوگا اس کا ایمان محفوظ رہے گا۔اس لیے ہمارے اکابر موت کے وقت ہنستے مسکراتے دنیا سے چلے جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ہی شیطان بد بخت کواس سے دور رکھتے ہیں۔دنیا کا بھی یہی دستور ہے کہ اپنے پیاروں کے قریب ڈاکوؤں اور چوروں کو کوئی نہیں آنے دیتا۔اللہ تعالیٰ بھی اپنے پیاروں کے قریب موت کے وقت اس شیطان بد بخت کونہیں آنے دیتے۔تو ایمان ہمیشہ کے لیے۔ہم ایک سیکنڈ کے لیے بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم ایمان والے نہیں ہیں۔یادرکھیں! بستہ بستن سے ہے۔یعنی بندھنے سے۔اور ایمان بندھنے کا دوسرا معنی ہے لہٰذا ہم ہر ہر لمحے کے لیے اللہ کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اصل تو شریعت ہی ہے:

طریقت، حقیقت میں شریعت کی محافظ اور شریعت کی خادمہ ہے۔یہ شریعت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔احسان ہوگا تو نماز محفوظ، احسان ہوگا تو گناہوں سے محفوظ، اصل تو شریعت ہی ہے۔

صحبتِ صلحاء، بے ریا عبادت سے افضل کیوں؟

ایک مرتبہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا: حضرت! شاعر لوگ جب شعر کہتے ہیں تو کسی کو گھٹا دیتے ہیں اور کسی کو بڑھا دیتے ہیں...... یہ ایک انسانی فطرت ہے، گھٹا بڑھا دیتے ہیں، افراط وتفریط کے مرتکب ہو جاتے ہیں...... حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: کیسے؟ انہوں نے کہا: حضرت! مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ شعر کہا ہے ؎

یک زمانہ صحبتے با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

مجھے تو اس میں افراط وتفریط نظر آتی ہے کہ اللہ والوں کی ایک لمحہ کی صحبت سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔ اگر یہ کہہ دیتے کہ سو سال کی عبادت سے بہتر ہے تو کہا جا سکتا تھا کہ ہاں بھئی! ریا والی عبادت ہوگی جس سے واقعی بہتر ہے۔ وہ کہتے ہیں: نہیں سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے، اس لیے مجھے اس میں افراط وتفریط نظر آتی ہے۔

اس کے جواب میں حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اچھا! میں اس شعر کو پڑھوں۔ انہوں نے کہا: جی حضرت! آپ پڑھیں۔ تو حضرت نے پڑھا: ؎

یک زمانہ صحبتے با اولیا

بہتر از ''لکھ'' سالہ طاعت بے ریا

یعنی اللہ والوں کی صحبت کا ایک لمحہ ایک لاکھ سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔

اب وہ اور زیادہ حیران ہوئے کہ سو سال سمجھ میں نہیں آ رہے تھے اور حضرت نے لاکھ سال کی بات کر دی۔ پھر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بات سمجھائی۔ حضرت نے فرمایا: دیکھو! اگر کوئی بندہ لاکھ سال تک عبادت کرے تو کیا اس کو اپنے ایمان کو محفوظ لے جانے کا یقین ہوتا ہے؟ عرض کیا: حضرت! یقین تو کسی کو نہیں ہو سکتا کہ پتہ نہیں موت کے وقت کیا ہوگا۔ حضرت نے فرمایا: دیکھیں! شیطان بدبخت نے کتنی عبادت کی تھی۔ ہزاروں سال۔ چپے چپے پہ سجدے کیے۔ بالآخر محروم ہو گیا۔ بلعم باعور نے تین سو سال عبادت کی اور اس کو دھتکار دیا گیا۔ اس لیے یہ یقین تو کسی کو بھی نہیں کہ موت کے وقت کیا ہوگا۔ اتنی عبادت کے باوجود بھی خطرہ ہے کہ پتہ نہیں موت کے وقت کیا ہوگا۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ لاکھ سال کے بعد بھی خطرہ ہے۔ کچھ نہیں کہہ سکتے اور اگر اللہ والوں کی تھوڑی دیر کی صحبت بھی انسان اختیار کر لے

تو نبی علیہ السلام گواہی دے رہے ہیں:

((هُمْ رِجَالٌ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ))

''یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا بد بخت نہیں ہوتا''

(اور بد بخت وہ ہوتا ہے جو موت کے وقت ایمان سے محروم ہو جائے)

جب اللہ کے محبوب ﷺ نے فرما دیا کہ وہ بد بخت نہیں ہوسکتا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی صحبت میں بیٹھنے والے کو اللہ تعالیٰ موت کے وقت ایمان کے ساتھ دنیا سے جانے کی توفیق دے دیتے ہیں۔ چنانچہ لاکھ سال کی عبادت سے بھی وہ نتیجہ نہ ملا جو ان کی ایک لمحہ کی صحبت سے مل گیا، اس لیے یہ صحبت زیادہ اعلیٰ ہوتی ہے۔

اخلاصِ نیت کا نام تصوف ہے:

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تصوف بدعت ہے، ان سے اتنی سی بات پوچھنے کی ضرورت ہے کہ اعمال کا دارومدار کس پر ہے؟ حالانکہ بخاری شریف کی پہلی حدیث ہی اس کے بارے میں ہے۔ ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ))۔ تو پھر نیت کو صحیح کرنا ضروری ہوا کہ نہ ہوا؟ وہ بے چارے بخاری شریف کا نام تو لیتے ہیں، کیا ہی بہتر ہوتا اگر وہ پہلی حدیث ہی غور سے پڑھ لیتے۔ پہلی حدیث ہی یہ بتا رہی ہے کہ اعمال کا دارو مدار نیت پر ہے اور نیت کو خالص کرنے کا نام ہی تو تصوف ہے۔ ہمارے مشائخ آٹھ آٹھ سال اپنے مشائخ کی خدمت کرتے تھے اور اتنے طویل عرصے کے بعد فرماتے تھے کہ ہم نے ابھی تک فقط نیت کرنا سیکھی ہے۔ یہ نیت ایسے ہی تھوڑا سیکھی جاتی ہے۔ یہ نیت مشائخ کی جوتیاں سیدھی کرنے سے آتی ہے۔

یاد رکھیں! ہندوستان میں تو اسلام آیا ہی مشائخ کے ذریعے سے اور پھر اللہ نے اسلام کو چمکایا علما کے ذریعے سے۔ اس لیے ہم علما کے بھی قدر دان ہیں اور مشائخ کے بھی۔

سلاسل تصوف کی منزل:

تصوف کے تمام سلاسل کی منزل ایک ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ جی! وہ کیسے؟ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ دیکھو! پہاڑ کی چوٹی پر ایک محل بنا ہوا ہے۔ ایک راستہ اِدھر سے جاتا ہے، دوسرا راستہ اُدھر سے، تیسرا اِدھر سے اور چوتھا اُدھر سے۔ تو راستے مختلف ہیں مگر منزل ایک ہی ہے۔ اسی طرح یہ چار راستے محسوس ہوتے ہیں مگر ان سب کی منزل ایک ہی ہے۔ شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

''کوئی نقشبندی ہے، کوئی چشتی ہے، کوئی قادری ہے، کوئی سہروردی ہے، اگر دل میں ایک خدا کی یاد ہے تو تم سب کچھ ہو ورنہ تم کچھ بھی نہیں ہو۔''

تو تمام سلاسل کا مقصود اللہ رب العزت کی یاد ہے اور سلسلہ کے اسباق سے انسان کو یہ کیفیت نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ نیت انسان مشائخ کے پاس آ کر سیکھتا ہے۔ نیت سے ہی تو عمل بدل جاتا ہے۔

غسل کرنے میں نیت کا دخل:

مولانا یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے والد تھے، ان کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ جب گرمیوں کے موسم میں عصر کے وقت مدرسے سے چھٹی ہوتی تھی تو وہ ایک کنویں پر چلے جاتے تھے۔ وہاں جا کر بیٹھ جاتے اور طالب علموں کو کہتے کہ میرے اوپر ڈول بھر بھر کے ڈالتے جاؤ۔ یوں سینکڑوں ڈول پانی کے ڈلواتے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ہمسایہ تھا۔ وہ ایک دن کہنے لگا: ''مولانا! ہمیں تو کہو اسراف ہووے، خود کرتے جاؤ۔'' یعنی مولانا! ہمیں تو آپ کہتے ہیں کہ یہ اسراف اور فضول خرچی ہے اور خود سینکڑوں ڈول ڈلواتے رہتے ہیں، یہ بھی تو اسراف ہے۔ تو وہ چونکہ قریبی بھی تھا اور بے تکلفی بھی تھی، اس لیے حضرت جواب دیتے تھے: یہ

میرے لیے جائز اور تیرے لیے حرام۔ چنانچہ ایک دن وہ کہنے لگا: مولانا! مجھے یہ بات آپ سمجھا دیں کہ آپ کے لیے کیسے جائز ہے اور میرے لیے کیسے حرام ہے؟

ایک دن منت کرنے لگا: مولانا! آج تو آپ یہ مسئلہ سمجھا ہی دیں۔ تو پھر مولانا نے ان کو بات سمجھائی اور پوچھا: اچھا! جب تم کنویں پر آتے ہو تو کس نیت سے آتے ہو؟ اس نے کہا: جی! نہانے کی نیت سے آتا ہوں۔ فرمایا: پھر تیرے لیے یہی حکم ہے کہ پانچ ڈول سے نہاؤ اور پھر چلے جاؤ، اس سے زیادہ کرو گے تو اسراف ہوگا۔ اس نے پوچھا: آپ کیا کرتے ہیں؟ فرمانے لگے: میں تو بیمار آدمی ہوں، اس لیے گرمی کے موسم میں ٹھنڈک حاصل کرنے کی نیت سے آتا ہوں۔ چنانچہ اس طرح ایک ہزار ڈول بھی ڈال لوں تو میرے لیے جائز ہوگا۔

اب دیکھیں کہ یہ ایک چھوٹا سا عمل ہے، اگر اس کو ایک عام آدمی کرتا تو شریعت اسراف کا حکم لگا کر حرام کہتی ہے اور اگر اسی عمل کو ایک عالم کرتا ہے لیکن بیماری دور کرنے کا سبب سمجھ کر استعمال کرتا ہے تو شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ نیت کا سیکھنا بھی ضروری ہے۔

وقوفِ قلبی میں مدد کیسے:

اچھا! یہ بتائیں کہ ہوائی جہاز پر سوار ہوتے وقت کون سواری کی دعا پڑھتا ہے۔ اس طرف دھیان ہی نہیں جاتا کہ یہ بھی کوئی سواری ہے۔ بھئی! سواری پانی میں چل رہی ہو یا ہوا میں جا رہی ہو، ہے تو سواری۔ اس لیے دعا تو پڑھنی چاہیے۔

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَ مُرْسٰهَا اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾ (ھود: ۴۱)

لیکن لفٹ کا بٹن دباتے ہوئے نہیں یاد آئے گا، جب تک شیخ نہیں بتائے گا کہ یہاں بھی کوئی دعا پڑھنی ہے۔ بہت سے لوگ حج عمرے پر جاتے ہیں اور حرم شریف میں نمازوں کے بعد اعلان ہوتا ہے: الصلوۃ علی الاموات۔ ''نماز جنازہ

ہوگی۔'' یہ اعلان سن کر کتنے لوگ ہیں جو ﴿ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ﴾ پڑھتے ہیں۔علما بھی جاتے ہیں اور سنتے بھی ہیں، ذرا دل سے پوچھیں کہ کبھی ﴿ اِنَّا لِلّٰہ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ﴾ پڑھی ہے۔حالانکہ الصلوٰۃ علی الاموات کے الفاظ سے ایک میت کی خبر مل رہی ہے۔تو میت کی خبر ملنے پر سنت کیا ہے؟ ﴿ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ﴾ پڑھنی چاہیے،تو پھر کیا اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنی یاد آتی ہے؟ بھئی! یادتو تب آئے گی نا، جب شیخ یاد کرائے گا۔ یہ شیخ ہی بتاتا ہے کہ مسنون دعائیں پڑھنے سے وقوف قلبی میں مدد اور تقویت ملتی ہے۔

مشائخ کے ہاں علم کی قدر و منزلت:

مشائخ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ علم کے مخالف ہوتے ہیں۔بھئی! مشائخ صوفیا علم کے مخالف نہیں ہوتے۔ ہاں! اگر کسی بندے نے کسی خاص جذبے میں اور کسی خاص کیفیت میں ایسی بات کر دی تو وہ انفرادی بات کہی جائے گی۔اور جو لوگ کہیں ''علموں بس کریں او یار'' ہم ان کے پیچھے چلنے والے نہیں۔ہمارے جتنے بھی مشائخ تھے وہ سب کے سب علم کے زیور سے آراستہ تھے۔چنانچہ طبقہ اول کے تمام مشائخ اپنے مریدین کو علم حاصل کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔مثال کے طور پر:

☆......سید الطائفہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

مَنْ لَمْ یَقْرَءِ الْقُرْآنَ وَلَمْ یَکْتُبِ الْحَدِیْثَ لَایُقْتَدٰی بِہٖ فِیْ ھٰذَا الْاَمْرَ

''جو قرآن اور حدیث نہیں پڑھا وہ ہمارے اس کام کے اندر مقتدا ہی نہیں۔''

ہمارے مشائخ تو حکم فرماتے تھے۔

☆......مکتوبات صدی میں بھی لکھا ہے کہ سالک کو علم حاصل کیے بغیر اس راستے پر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔

☆......ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ جیسی ناقد اور محتاط شخصیت بھی فرماتے ہیں:

وَ مَا كَانَ الْمُتَقَدِّمُوْنَ فِي التَّصَوُّفِ اِلَّا رُؤُوْسًا فِي الْقُرْآنِ وَالْفِقْهِ وَالْحَدِيْثِ

''تصوف کے متقدمین قرآن، فقہ، اور حدیث میں سردار تھے''

انہوں نے یہ عبارت تلبیس ابلیس کے اندر لکھی ہے۔

معلوم ہوا کہ ایسے حضرات بھی مشائخ اور صوفیا کو ماننے والے تھے۔

مشائخ پر اعتراضات کیوں ہوئے؟

یہاں سوال ذہن میں آتا ہے کہ پھر مشائخ پر اعتراضات کیوں ہوئے؟

بھئی! بسا اوقات انسان کے اندر کسی کا کلام سمجھنے کی استطاعت نہیں ہوتی۔ اور جب سمجھ نہیں پاتا تو انسان کی فطرت ہے کہ

''اَلنَّاسُ اَعْدَاءٌ لِمَا جَهِلُوْا''

جب بات سمجھ میں نہیں آتی تو مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے مشائخ کی مخالفت ہوئی۔ مثلاً

☆......ایک ایسا وقت آیا کہ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کو جلا دیا گیا۔ اور بعد میں جب دوسرے علما نے ان کی باتوں کو کھولا تو غلط فہمی دور ہونے پر آب زر سے لکھوایا گیا۔ لہذا پتہ چلا کہ جہاں کہیں ایسا ہوا تو وہ بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا۔

☆......کتاب الشفا کے مصنف قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ پر بعض لوگوں نے یہودیت کی تہمت لگا دی۔ اور بعد میں حقیقت کھلی تو پھر اس کتاب کو شفائے شریعت کہنے لگے کیونکہ نبی علیہ السلام کے بارے میں واقعی کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی۔

☆......شیخ احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مرتبہ ملحد اور کافر کہہ کر سر عام رسوا کیا گیا اور پھر ایک وہ وقت آیا کہ جب ان کو بہت بڑا شیخ مانا گیا۔ وجہ یہی بنی کہ لوگوں نے ان کی

باتوں کے اپنے مطلب نکال لیے تھے۔ بھئی! جو صاحب کلام ہوتا ہے، حق اسی کا ہوتا ہے کہ وہ بتائے کہ میرے کلام کی منشا کیا ہے۔ اب یہ تو مناسب نہیں کہ کہنے والا کسی اور مقصد کے لیے بات کہے اور سننے والے نے اپنا مطلب نکال لیا۔ وہ تو پتہ نہیں کیا سے کیا مطلب نکال لیں گے۔ اسی کو تو کہتے ہیں:

تَوْجِیْهُ الْقَوْلِ لِمَا لَا یَرْضٰی بِهِ الْقَائِلِ

''قول کا ایسا معنیٰ کرنا جس پر قائل راضی نہ ہو''

کہنے والے نے کہا: روکو! مت جانے دو۔ اور مطلب نکالنے والے نے کہا: روکو مت! جانے دو۔ یعنی بات کچھ تھی اور نتیجہ کچھ نکال لیا۔ ان مشائخ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

پاکباز مشائخ کا دفاع:

چنانچہ اللہ رب العزت نے مختلف ادوار میں ایسی عبقری شخصیات کو پیدا کیا جنہوں نے ان پاکباز مشائخ کا دفاع کیا۔ مثال کے طور پر:

☆......ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ''صفوۃ الصفوۃ'' کتاب لکھی۔

☆......علامہ شمس الدین ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''سِیَرُ اَعلَامِ النُّبَلا'' کتاب لکھی۔

☆......عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ نے ''نفحات الانس'' کتاب لکھی۔

☆......شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''اخبار الاخیار'' کتاب لکھی۔

☆......علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الطبقات الکبریٰ'' کتاب لکھی۔

ان کتابوں میں ان علما نے مشائخ صوفیا کی زندگیوں کو کھولا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کے ذہنوں میں ان مشائخ کے بارے میں جو شکوک وشبہات تھے وہ سب ختم ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اس پاک باز جماعت کے دفاع کا خود انتظام فر دیا۔

اس کے علاوہ تصوف پر جو اور اعتراضات تھے، امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

نے آکر ان تمام اعتراضات کی مٹی کو صاف کر دیا۔ چنانچہ ان کے مکاتیب کو پڑھ کر دیکھیے، واقعی انہوں نے شریعت وطریقت کے تلازم کو سامنے رکھا۔

قریب کے زمانے میں حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اتنا علم ظاہری بھی عطا کیا کہ حضرت نے دو ہزار سے زیادہ کتابیں لکھیں اور علم باطن سے بھی اللہ نے نوازا۔ اگر آپ ان کی تفسیر ''بیان القرآن'' کا حاشیہ پڑھیں تو اس میں ''مسائل سلوک'' کے نام سے قرآن کی آیات سے اخذ ہونے والے سلوک کے مسائل کو کھولا گیا ہے۔ بندہ پڑھ کر حیران ہوتا ہے کہ اللہ والوں کو قرآن پڑھ کر واقعی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

اعتدال کا راستہ:

ہمارا راستہ اعتدال کا راستہ ہے۔ ہم علم کے پیچھے اتنا بھی نہیں پڑتے کہ مشائخ کو برا سمجھیں اور مشائخ کے بھی اتنا پیچھے نہیں لگتے کہ علم کو برا سمجھیں ؎

درکفِ جام شریعت درکفِ سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام وسندان باختن

ہر بندہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ ہمارے اکابر علما دیو بند کو اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ ہم ان لوگوں میں سے بھی نہیں جو اَلعِلمُ حِجَابُ الاَکبَر کا نعرہ لگا کر علمائے کاملین کو گمراہ کہیں۔ اور نہ ہی ان لوگوں میں سے ہیں جو تصوف کو عجمی چیز کہیں اور نماز کی حضوری سے محروم رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مشائخ جب مسندِ حدیث پر بیٹھتے تھے تو عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اور قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ کی یادیں تازہ کر دیتے تھے اور جب مسند ارشاد پر بیٹھتے تھے تو جنید اور بایزید رحمۃ اللہ علیہ نظر آیا کرتے تھے۔

مقصودِ تصوف:

تصوف کا مقصد تین باتیں ہیں۔

(۱) خوفِ خدا...... (۲) اتباعِ مصطفیٰ ...... (۳) مخالفِ نفس وھوٰی

جس کو یہ تین چیزیں حاصل ہیں اس کو تصوف کا مقصود حاصل ہو گیا۔ اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھ کر یہ چیزیں انسان کو نصیب ہوتی ہیں۔ بتائیں! کیا یہ تین چیزیں شریعت سے ہٹ کر ہیں۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ پھر کیوں تصوف کی مخالفت کرتے ہیں۔

کسی نے حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: حضرت! تصوف کا مقصود کیا ہے؟ تو حضرت نے عجیب جواب دیا۔ فرمایا: تصوف کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی رگ رگ اور ریشے ریشے سے گناہوں کا کھوٹ نکل جائے۔

علماء مشائخ کی دہلیز پر:

وقت کے بڑے بڑے علما نے آ کر مشائخ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مثال کے طور پر:

⊙ ......علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا خالد رومی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

⊙ ......قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے مرزا جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی۔

⊙ ......حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی۔

⊙ ......جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی حضرت مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی۔

⊙ ......علاوہ ازیں حضرت قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت جالندھری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے مشائخ سے علم ظاہر بھی حاصل کیا اور علم باطن سے بھی مزین ہوئے۔

یہ ہمارا راستہ ہے جسے ہم اعتدال کا راستہ کہتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہمیں

اعمال بھی نصیب ہوں اور اعمال کی کیفیات بھی نصیب ہوں۔

سیرت پر زیادہ محنت کریں:

دیکھیں! ایک ہوتا ہے، بانس۔ وہ خشک ہوتا ہے اور اس کی ایک خاص شکل ہوتی ہے۔ اور ایک ہوتا ہے، گنا۔ اگر آپ اگنے والے پتلے بانس کو کاٹیں اور ادھر سے گنے کو کاٹیں تو قریب رکھنے سے دونوں بالکل ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ مگر ایک رس سے خالی ہوتا ہے اور دوسرا رس بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح جو بندے تصوف کو سیکھے بغیر اعمال کرتے ہیں، وہ بانس کی طرح ہیں اور جو سیکھ کر اعمال کرتے ہیں وہ گنے کی طرح ہوتے ہیں۔ یعنی ایمان کی حلاوت سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

اگر ایک عام مزدور کو آپ گھر لائیں اور کہیں جی! فرش توڑنا ہے تو وہ آئے گا، ہتھوڑا چلائے گا اور شام کو اپنی مزدوری لے کر چلا جائے گا۔ البتہ وہ ہتھوڑا چلاتے ہوئے بے دلی سے چلائے گا۔ اور ایک تھا، فرہاد۔ اس کو لوگوں نے کہا تھا کہ اگر تم پہاڑ کھود کر دودھ کی نہر نکالو تو تمہارے محبوب سے تمہارا وصل ہو جائے گا۔ وہ بھی پہاڑ توڑتا تھا۔ لیکن جو ضرب مزدور لگاتا ہے وہ بے دلی سے لگاتا ہے اور جو فرہاد ضرب لگاتا تھا وہ دل کی محبت سے لگاتا تھا۔ کہنے والے نے کہا: ؎

ہر ضرب تیشہ ساغرِ کیفِ وصال دوست
فرہاد میں جو بات ہے مزدور میں نہیں

''جب فرہاد ضرب لگاتا تھا تو ہر تیشے کی ضرب پر اس کو لگتا تھا کہ میں اپنے محبوب کے وصل کا جام پی رہا ہوں۔ اس لیے کہ مزدور میں عشق کی وہ بات ہی نہیں تھی جو فرہاد میں تھی۔''

آج ہم مزدور والی نمازیں پڑھ رہے ہوتے ہیں، جبکہ اللہ والے فرماتے ہیں: آؤ! فرہاد والی نمازیں پڑھو۔ ہم بے ذوق سجدے اور بے سرور نمازیں کب تک

پڑھتے رہیں گے۔اپنے من کو صاف کر لیں تا کہ پھر ایسی نماز نصیب ہو کہ

((اَنْ تَعْبُدُوا اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ وَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))

کا مصداق بن جائیں اور صورت کی بجائے سیرت پر زیادہ محنت کریں۔

دلِ مردہ، دل نہیں ہے......:

اللہ تعالیٰ ہمیں دلوں کو جگانے کی توفیق عطا فرمائے ؎

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

جب دل زندہ ہو جاتا ہے تو پھر انسان اللہ رب العزت کی رضا کے لیے اعمال کرتا ہے۔ چنانچہ ہمارے مشائخ نے فرمایا: نہ ہم نے رونا ہے نہ رلانا ہے، نہ اڑنا ہے نہ اڑانا ہے، ہم نے تو بس روٹھے یار کو منانا ہے۔ تصوف کا مقصود بھی یہی ہے کہ اللہ راضی ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ اس وقت راضی ہوتے ہیں جب انسان کے دل میں خوفِ خدا ہو، اس کے اعمال میں اتباعِ مصطفےٰ ہو اور مخالفتِ نفس وھوٰی ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنی اصلاح کی تڑپ عطا فرما دے۔ جب دل میں آگ لگ جاتی ہے تو پھر بندے کو اپنی اصلاح کے لیے وقت گزارنا آسان ہو جاتا ہے۔

اللہ رب العزت ہمارے من کی بیماریوں کو ختم فرما دے اور ہمیں اپنی سچی محبت عطا فرما دے۔ (آمین ثم آمین)

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ